ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیرِ مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

1	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	4.00
2	راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00
3	قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00
4	مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	12.00
5	قرآن اور امن عالم	2.00
6	رسول کامل ﷺ	6.00
7	نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت	4.00
8	نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	3.00
9	معراج النبی ﷺ	3.00
10	شہید مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ)	4.00
11	سانحۂ کربلا (شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا اصل پس منظر)	3.00
12	اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام	2.00
13	اسلام میں عورت کا مقام	10.00
14	عظمت صوم	2.00
15	عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	3.00
16	اسلام اور پاکستان	5.00
17	علامہ اقبال اور ہم	2.00

تراجم

1	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن (قرآن مجید کے حقوق کا عربی ترجمہ)		5.00
2	حقوق قرآن بر مسلمان	(" " " فارسی ترجمہ)	
3	The Obligations Muslims owe to the Quran.	(انگریزی ترجمہ)	5.00
4	The way to Salvation in the light of Surah Al Asr.	(راہِ نجات " " ")	5.00
5	The Quran & World Peace.	(قرآن اور امن عالم " " ")	4.00
6	Islamic Renaissance The Real Task Ahead.	(اسلام کی نشاۃ ثانیہ " " ")	4.00
7	Rise & Decline of Muslim Ummah.	(سرافگندیم کا ایک باب " " ")	5.00

وَمَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ
خَیراً کَثِیراً
(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین ، ایم اے ، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ ، مرحوم
مدیر اعزازی : ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ، ایم فل ، پی ایچ ڈی ،
مدیر : محمد رفیق چودھری
معاون مدیر : حافظ عاکف سعید ، ایم اے (فلسفہ)

شمارہ ۱۱	جنوری ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ	جلد ۳

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴
فون : ۸۵۲۶۱۱

مضمون نگار حضرات کی آرار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فہرس

حرفِ اوّل ——— ۳

ڈاکٹر ابصار احمد

الٓمّٓ (سورہ یونس) ——— ۵

ڈاکٹر اسرار احمد

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات ——— ۱۳

سورہ تغابن کی روشنی میں (قسط ۳)

ڈاکٹر اسرار احمد

مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول ——— ۱۹

سورہ حجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

خودی اور تعمیرِ معاشرہ ——— ۲۷

ڈاکٹر عبدالخالق

سیرت نبویؐ قرآن حکیم کی روشنی میں ——— ۳۴

محمد رفیق چودھری

قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت (۱۲) ——— ۴۸

مولانا محمد تقی امینی

مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت (۳) ——— ۵۵

مولانا محمد طاسین

تبصرہ کتب ——— ۷۰

سالانہ زرِ تعاون : ۳۰ روپے ——— فی شمارہ : ۳ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

دینِ اسلام دو انتہائی اہم اجزاء کا مرکب ہے - اوّلاً نظام فکر یا عقائد اور ثانیاً کردار و افعال - قرآن حکیم کی اصطلاح میں ایسا مابعد الطبیعاتی مجموعہ عقائد جو عمل کی اساس بنے، کردار و سیرت کی تشکیل کرے اور اس کی اپنی نوعیت تخلیقی اور حرکی ہو، ایمان کہلاتا ہے - اور اگر اس سے زندگی، عمل و کردار اور تخلیق کی خصوصیات الگ کر دی جائیں تو وہ پھر محض عقیدہ (DOGMA) رہ جاتا ہے - ایمان کا یہ درجہ اصطلاحاً اقرار باللسان یا اسلام کا درجہ بھی کہلاتا ہے - لیکن ایمان فی الحقیقت اور اصلاً وہی عقیدہ ہے جس سے عمل و کردار کی راہ استوار ہو اور تخلیقی اور حرکی قوتوں کے سوتے پھوٹیں - دوسری طرف دینِ اسلام میں اصل اہمیت اس عمل کی نہیں ہے جو مطلق ——— جدوجہد یا تگ و دو ہو، بلکہ اس عمل کی ہے جو حرکت اور سعی و جہد کے ایسے امتزاج کا نام ہے جس کا سرچشمہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسل ہو - اخلاق و آداب کو پاکیزگی بخشے اور انابت الی اللہ میں ممد و معاون ہو اور اس کی صفات توحید و عدل کی روشنی میں معاشرہ کی بالفعل ترتیبِ نو میں مہمیز کا کام دے - یہی وہ اہم فریضہ ہے جسے قرآن شہادت علی الناس، اقامتِ دین اور اظہارِ دین جیسی اہم اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے -

اگر عمل کے محرکات صحت مند نہیں ہیں، فاعل کی نظری بنیادیں صحیح نہیں ہیں، ان کی سمت متعین نہیں ہے، جڑیں مضبوط نہیں ہیں اور رخ تہذیبی و عمرانی اعتبار سے مثبت خصوصیات کا حامل نہیں ہے تو یہ ایک نوع کی حرکت اور جدوجہد تو ضرور ہے، لیکن قرآن کی اصطلاح میں حقیقی عمل یا عملِ صالح نہیں ہے - تخلیقی اور مثمر ایمان و عمل کو قرآنِ حکیم نے اس حکیمانہ انداز و اسلوب میں بیان فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ (ابراہیم: ۲۵)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا، اللہ نے پاکیزہ بات کی کیسی مثال بیان فرمائی جیسے پاکیزہ درخت، جس کی جڑ قائم اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ یہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سرتاسر زندگی اور عمل کا مذہب ہے اور اسی بنا پر یہ ہمیں تعمیر فرد اور تعمیر معاشرہ سے متعلق جملہ مسائل کا حل دیتا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اسلامی معاشرہ کے جو صدیوں سے انفعال اور غیر تخلیقی رجحانات کا شکار رہا ہے، علاج کی فکریں کریں۔ اور اسلام اور توحید کے فکر انگیز اور انقلابی پیغام کو عام کرکے دین حق کی برتری تمام باطل ادیان اور نظام ہائے زندگی پہ قائم کردیں۔

زیر نظر شمارے میں بعض مستقل سلسلہ وار مضامین کے علاوہ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامع پنجاب کا ایک فکر انگیز مضمون بعنوان "خودی اور تعمیر معاشرہ" شامل ہے۔ حقیقت انسان کے عنوان سے برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد جو مسلسل مضمون لکھ رہے ہیں، اس کی اگلی قسط انشاء اللہ اگلے شمارے میں شامل کی جائے گی۔

ابصار احمد عفی عنہ

سلسلہ تقاریر الٓمّٓ

سورہ یونس

مقرر : ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم ! نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۔ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۔

صدق اللہ العلی العظیم ۔

سورۂ عنکبوت سورۂ روم، سورۂ لقمان اور سورۂ سجدہ کے علاوہ قرآن حکیم کی دو سورتیں اور ہیں جن کا آغاز حروف مقطعات الٓمّٓ سے ہوتا ہے یعنی سورہ بقرہ اور سورۂ آل عمران لیکن ان سورتوں اور ان سورتوں اور ان کے مابین ایک فصل مصحف میں بھی ہے یعنی پہلی یہ چار سورتیں بیسویں اور اکیسویں پارے میں ہیں ۔ سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران، سورہ فاتحہ کے بعد مصحف میں متواتر دو طویل سورتیں ہیں جو تقریباً چار پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں ۔ اسطرح ایک دوسرا فصل ان کے زمانہ نزول میں بھی ہے یعنی جبکہ وہ چار سورتیں سن ۴ یا ۵ نبوی میں نازل ہوئیں ۔ وہاں یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں یعنی ہجرت نبوی کے بعد ان کا نزول ہوا ۔ لہذا ان کے بارے میں گفتگو انشاء اللہ آخر میں ہوگی ۔

ان کے علاوہ قرآن حکیم کی پانچ سورتیں وہ ہیں جو تین تین حروف مقطعات الٓرٰ سے شروع

ہوتی ہیں یعنی سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ یوسف، سورۂ ابراہیم اور سورۂ حجر۔ الٓرٰ کے بارے میں یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ حبرالامہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی بجائے یہ ہے کہ یہ حروف ایک پورے جملے کے مخفف ہیں وہ جملہ ہے۔ اَنَا اللّٰہُ اَرٰی یعنی میں اللہ دیکھ رہا ہوں۔ واللہ اعلم۔

سورہ یونس جو ۱۰۹ آیات اور ۱۱ رکوعوں پر مشتمل ہے تقریباً پوری کی پوری رسالت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر ہے چنانچہ اس کا آغاز ہوتا ہے ان آیات مبارکہ سے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۔ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۔

"الٓرٰ ۔ یہ ایک حکمت بھری کتاب کی آیات ہیں۔ کیا لوگوں کے لیے یہ بات بہت تعجب کا باعث بن گئی ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک شخص (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی کی۔ کہ لوگوں کو خبردار کیجیے اور اہل ایمان کو بشارت دیجیے کہ ان کیلئے بڑا بلند رتبہ ہے ان کے رب کے پاس۔ تو کافروں نے یہ کہا کہ یہ شخص تو ایک کھلا جادوگر ہے۔"

اس میں ایک طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے اور اس کے لیے دلیل کے طور پر قرآن مجید کو پیش کیا گیا ہے اور دوسری طرف لوگوں کے انکار اور ان کے تعجب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اصل مظہر قرآن مجید ہے لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے بڑھ چڑھ کر جو مخالفت کی تو وہ حضور کی نہیں بلکہ قرآن حکیم کی کی۔ یہی وجہ ہے اس سورہ مبارکہ میں قرآن مجید کے بارے میں بالتکرار و اعادہ گفتگو ہوئی ہے مختلف پہلوؤں سے اس کا اثبات کیا گیا ہے کہ یہ کلام اللہ ہے اس کی عظمت کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اسکے ہدایت اور رحمت ہونے کو مبرہن کیا گیا ہے۔

چنانچہ ان ابتدائی آیات کے بعد چند آیات میں توحید اور معاد کا ذکر کیا گیا اور پھر لوگوں کا یہ قول نقل کیا گیا۔

اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط

اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارا جھگڑا آپ سے نہیں ہے اس قرآن سے ہے آپ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن پیش کیجیے یا اس میں کوئی تبدیلی کر دیجیے اس کا جواب یہ دلوایا گیا۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ

اے نبیؐ! کہہ دیجیے میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اس قرآن میں کوئی ترمیم یا تبدیلی اپنے جی سے کر دوں۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ

میں تو محض پابند ہوں اس کا کہ جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ

"اور اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی روش اختیار کر لی تو پھر میں خود ڈرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے، ایک بڑے دن کی سزا سے"

یہ مضمون سورہ انعام میں بھی آیا ہے اس کی آیت نمبر ۳۳ میں فرمایا گیا کہ۔

"اے نبیؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے آپ کو رنج ہوتا ہے۔ لیکن آپؐ مغموم اور ملول کیوں ہوتے ہیں آپؐ ان کی باتوں سے اسقدر گہرا اثر کیوں قبول کرتے ہیں! یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلا رہے، انہوں نے کبھی آپؐ کو جھوٹا نہیں کہا۔ بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات (قرآن) کا انکار کر رہے ہیں۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ ط وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ط

وہ آپ کو نہیں جھٹلا رہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابوجہل جیسا کٹر دشمن بھی کبھی یہ نہ کہہ سکا کہ نعوذ باللہ من ذالک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جھوٹے ہیں یہ کہنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اللہ نے فرمایا کہ ان کا جھگڑا آپؐ سے نہیں بلکہ ہماری کتاب سے ہے۔ ہماری وحی سے ہے اس کتاب کی تعلیمات سے ہے اس سلسلہ میں آگے فرمایا گیا۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ

اے نبیؐ! ان سے کہیے کہ یہ قرآن میں اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہا، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فرض منصبی پر مامور نہ کیا ہوتا، وہ نہ چاہتا تو نہ میں یہ کتاب یہ قرآن تمہیں پڑھ کر سناتا، نہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

تو ذرا سوچو تو سہی میں اس سے قبل تمہارے مابین ایک عمر گزار چکا ہوں تو کیا عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر مجھے اپنی ہی طرف سے گھڑ کر کتاب پیش کرنی ہوتی تو آخر میں تمہارے درمیان رہا ہوں۔ میں نے اپنی عمر عزیز کے چالیس برس تمہارے مابین بسر کیے کبھی میں نے تصنیف و تالیف کی کوئی کوشش تو کی ہوتی، کبھی میں نے اس مشق پر کسی صاحب فن سے کوئی اصلاح بھی لی ہوتی۔ میری پوری زندگی تمہارے سامنے ہے یہ جو اچانک میں تمہارے سامنے یہ کلام پیش کر رہا ہوں تو یہ صرف اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی ہے اور اب میں خود بھی پابند ہوں اس کا کہ جو مجھ پر وحی کی جا رہی ہے۔ اور میں اس کو تم تک پہنچا دینے پر مامور ہو گیا ہوں۔ اس ضمن میں آگے فرمایا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

لوگو! سوچو، غور کرو کیا یہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اس کو گھڑ لے۔ آگے فرمایا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کیا انکے اندر اتنی ڈھٹائی اور جسارت ہے کہ وہ یہ کہیں کہ یہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گھڑ لیا ہے۔ اب دیکھئے یہی الفاظ تھے جو سورہ سجدہ میں بھی آئے تھے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ

لیکن وہاں جواب جو تھا وہ خطابی انداز کا تھا۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ

"نہیں اے نبیؐ یہ آپ کے رب کی جانب سے حق ہے" یہاں دلیل دی جا رہی ہے اور دلیل بھی وہ جسے برہان قاطع کہا جائے اتمامِ حجت کے ضمن میں آنے والی شے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو پھر آؤ تمہارے لیے کھلا چیلنج ہے۔ اگر محمد یہ قرآن مجید تصنیف کر سکتے ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تو آخر تمہارے ہاں بڑے بڑے ادیب بڑے بڑے خطیب بڑے بڑے شعراء موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر لو اور اس قرآن کی سورتوں جیسی کوئی ایک سورت ہی تصنیف کر کے دکھا دو۔

ہم دیکھیں گے کہ یہ مضمون سورۂ بقرہ میں پھر آئے گا اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا۔ اگر تم یہ نہ کر سکو فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور ہرگز نہ کر سکو گے اور پھر ڈرو اس آگ سے جو منکروں اور کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ۔ اس سورہ مبارکہ میں عظمت قرآن کے بیان پر مشتمل ایک بڑی عظیم آیت وارد ہوئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت اور موعظت بھی آگئی ہے اور سینوں کے اندر جو امراض ہوتے ہیں ان کے لیے شفا بھی نازل ہو گئی ہے۔"

گویا قرآن مجید موعظت اور نصیحت پر بھی مشتمل ہے اور اگر انسان کے نفسیاتی امراض اس کے سینے میں جو روگ ہوتے ہیں، تکبر کا، بخل کا حبِ جاہ کا اور حبِ دنیا کا ان سب کا ازالہ کر دینے والی چیز بھی یہ قرآن ہی ہے۔ گویا تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی یہی ہے اور انسان کے جذبات و

احساسات میں جلا پیدا کرنے کے لیے بھی اس سے زیادہ مؤثر چیز اور کوئی نہیں ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے نصیحت کے لیے بھی قرآن کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو ذریعہ بنایا۔ تزکیۂ نفس کے لیے بھی قرآن مجید پر نعوذ باللہ من ذالک ہمارا اعتماد قائم نہ رہ سکا۔ اور ہم نے نہ معلوم کہاں کہاں سے طریقے مانگ کر اور مستعار لے کر انہیں اپنے ہاں تزکیۂ نفس کے لیے رائج کیا۔

فرمایا

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ۔

یہ اہل ایمان کے حق میں ہدایت بھی ہے بشارت بھی۔

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا۔

اے نبی کہہ دیجیے یہ اللہ کے فضل و رحمت سے ہے اس کتاب کا نزول اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام واحسان ہے نوع انسانی پر۔

هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۝

وہ کہیں بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جنہیں یہ جمع کر رہے ہیں یہ مال و دولت و دنیا یہ مال واسباب یہاں کی چمک دمک جس کے پیچھے یہ بھاگے اور دوڑے پھر رہے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ قیمتی اور وقیع یہ کتاب ہے، اس کی قدر کرو آخر میں فرمایا گیا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ۔

لوگو! تمہارے پاس حق آچکا ہے اب جو کوئی بھی ہدایت کی راہ اختیار کریگا وہ اپنے بھلے کے لیے اور جو کوئی بھی گمراہی کی روش اختیار کریگا اس کا سارا وبال خود اسی کی جان پر آئے گا اور کہہ دو اے نبیؐ! کہ میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا نہ جائے گا مجھ سے بازپرس نہ ہو گی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہ لائے۔

آخری بات حضورؐ سے ارشاد فرمائی گئی۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ ،

وہی بات جس سے آغاز ہوا تھا آپ اتباع کرتے رہیئے، پیروی کرتے رہیئے اس کی کہ جو آپ کی جانب وحی کیا گیا"

وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ

"اور صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادیں۔"

وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ۔

اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"

اس سورہ مبارکہ میں ایک عظیم آیت وہ بھی آئی ہے جو مقام ولایت کی وضاحت کرنے والی ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

"آگاہ ہو جاؤ جو اللہ کے دوست بن جائیں جو اس سے محبت کریں جو اسی کے ہو جائیں ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ حزن ہے ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بشارتیں ہی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی ان کیلئے بشارت ہی بشارت ہے۔"

اللھم ربنا اجعلنا منھم

اے پروردگار! ہمیں بھی اپنے فضل وکرم سے اپنے ایسے بندوں کے زمرے میں شمار فرما اور شامل ہونے کی توفیق عطا فرما۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

❋❋

اسلامی تصوّف کے موضوع پر

مشہور محقق پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی

مایۂ ناز تالیف

اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش

اس کتاب میں فاضل مولف نے ان عناصر اور عوامل کی نشاندہی کی ہے کہ جن کی وجہ سے اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش ہو گئی۔

یہ مایہ ناز کتاب قارئین کے بے حد اصرار پر اب دوبارہ عمدہ طباعت اور ڈائی دار جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کے حسنِ ظاہری میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

آفسٹ پیپر پر اعلیٰ طباعت، مضبوط اور خوبصورت ڈائی دار جلد قیمت -/۱۵ روپے

ناشر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

(قسط ۲)

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات

(سورۂ تغابن کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

اب ایمانیاتِ ثلاثہ میں سے ایمان بالرسل اور ایمان بالرسالت کا ایک نئے اسلوب و انداز سے بیان شروع ہوتا ہے۔ پانچویں آیت پڑھئے۔ فرمایا " اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ " ایمان بالرسالت کے باب میں پہلے ایک ضروری بات ذہن نشین کر لیجئے۔ قرآن مجید میں عموماً تینوں اساسی ایمانیات۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسالۃ اور ایمان بالآخرۃ، کا بیان اکٹھا آتا ہے۔ البتہ اسلوب و بیان بدلتا رہتا ہے۔ کہیں ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے، کہیں دوسرے پہلو سے بات کی جاتی ہے۔ یہاں ایمان باللہ کا قرآنی استدلال پیش کرنے اور ایمان بالآخرۃ کے متعلق چند اشارات کرنے کے بعد ایمان بالرسالت کا ایک خاص پہلو اور اسلوب سے بیان شروع ہوتا ہے۔ یہاں رسالت کا یہ خاص پہلو سامنے لایا جا رہا ہے کہ رسالت کوئی ہنسی مذاق کا معاملہ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی معمولی اور ایسی ویسی بات ہے کہ کوئی قوم جس کی طرف رسول مبعوث کیا جائے، رسول کو قبول کرے یا اس کا انکار کر دے تو اس رد و قبول سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ ہلاکت و بربادی اور عذاب و سزا لازم ہے اس قوم کے لئے جو کسی رسول کی دعوت سے انکار کر دے۔ دوسرا خاص پہلو یہاں یہ بیان ہو رہا ہے کہ رسالت کے باب میں جو سب سے بڑا مغالطہ انسان کو ہوتا ہے اور جس کے بارے میں شیطان انسان کو خوب ورغلاتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو اس تعجب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ایک انسان اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ بشریت اور رسالت تو متضاد چیزیں ہیں ——— ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر اللہ کی طرف سے کوئی رسول آتا تو وہ فرشتہ ہوتا۔ مافوق البشر ہوتا، مافوق الانسان ہوتا۔ مخلوق کی انسان کے علاوہ کوئی

نوع ہوتی۔ تب تو ہم رسالت کو تسلیم کر لیتے۔ لیکن بشر کے ساتھ رسالت کا تصور قابل قبول نہیں ہے۔
ان دونوں چیزوں کو واضح کیا گیا: اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ "کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبریں پہنچ نہیں چکی ہیں جنہوں نے کفر کیا پہلے"۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ سورہ تغابن مدنی سورت ہے اور مدینہ کے بھی اواخر دور کی سورت تو اس سے پہلے وہ ساری مکی سورتیں اتر چکی ہیں جن میں قوم نوحؑ، قوم ھودؑ، عاد و ثمود، قوم صالحؑ، قوم فرعون، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ، ان سب کے واقعات بیان ہو چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں صرف ایک حوالہ (Refesence) دیدیا ہے۔
اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ "خبریں آچکی ہیں، لازماً آچکی ہیں، بڑی مفصل آچکی ہیں پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہیں۔ ان قوموں کے ساتھ معاملہ ہوا کیا؟ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ انہیں اپنے کئے کا مزا چکھنا پڑا کہ نہیں؟ انہیں اس وبال سے دوچار ہونا پڑا کہ نہیں؟ جو ان کے اس ظلم کی وجہ سے ان پر آیا کہ انہوں نے انکار کیا اور اسی پر اکتفا کیا نہیں بلکہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ دردناک عذاب اخروی ابھی ان کے لئے اور ہے۔ دو سزائیں ہیں ان لوگوں کی جو رسول کی دعوت سے اعراض کریں۔ اس کا انکار کریں۔ ایک سزا یہ کہ دنیا میں ان پر عذاب لازماً آکر رہے گا۔ دوسری سزا یہ کہ آخرت میں انہیں نار جہنم میں دردناک عذاب سے لازماً سابقہ پیش آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ ہر قوم کے لئے اپنے انبیاءؑ و رسل بھیجتا ہے تاکہ وہ انسان کی فطرت میں ودیعت کردہ معرفت رب کو جلا بخشیں، لیکن جو لوگ نور فطرت اور نور وحی سے فیض اٹھانے سے انکار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو وہ اس دنیا میں بھی عذاب الٰہی کے سزاوار ہو جاتے ہیں اور آخرت میں بھی انجام بد سے دوچار ہوتے ہیں۔ سورہ توبہ میں منکرین حق کو رسل سابقین کی امتوں کے انجام پر متنبہ کیا گیا۔ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ کیا ان لوگوں کو ان کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے ہیں جیسے قوم نوحؑ اور عاد و ثمود، قوم ابراہیمؑ اور اہل مدین اور الٹی ہوئی بستیاں، ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی اور روشن نشانیاں لے کر آئے۔ (لیکن انہوں نے انکار کیا) سو اللہ نے تو ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی (اس انکار کے باعث) اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ رسولوں کا انکار لازماً عذاب دنیوی پر منتج ہوتا ہے۔ نبی اور رسول کے مابین ایک فرق یہ بھی ہے کہ نبی کے انکار پر یہ معاملہ نہیں ہوتا کہ عذاب دنیا لازمی نازل ہو۔

انبیاء تو قتل بھی کیۓ گئے، اللہ کے نبی حضرت یحییٰؑ قتل کر دیۓ گئے ۔ لہٰذا نبوّت کا معاملہ اور ہے ۔ اور رسالت کا معاملہ اور۔ متعین طور پر جب کسی رسول کو کسی قوم کی طرف مبعوث کر دیا جائے تو وہ رسول قوم کے حق میں خدا کی عدالت بن کر آتا ہے ۔ اگر مانو گے تو ہر طرح کا انعام واکرام ہے اور اگر اعراض اور انکار کرو گے تو یہیں دنیا میں نقد ہلاکت مقدر ہو کر رہے گی۔ اس کے بعد جو عذاب اخروی ہے وہ اس پر مزید ہے ۔ یہ تمام وہ حقیقتیں ہیں جو ان واقعات سے معلوم ہوئیں جن کا ریفرنس دیا گیا ہے۔ اب اگلی یعنی چھٹی آیت میں ان واقعات کے بطور نتیجہ اور تجزیہ یہ بات بتائی جارہی ہے کہ ایسا کیوں ہوا ؟ فرمایا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۔ یہ اس انجام بد سے اس لئے دوچار ہوئے ۔ ذٰلِكَ سے اشارہ کر دیا گیا۔ ان کے انجام بد کی طرف ۔ ہلاکت دنیا میں اور دردناک عذاب آخرت میں۔ یہ اس لئے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ اور واضح تعلیمات کے ساتھ آئے ۔ واضح معجزات اور دلائل و براہین کے ساتھ آئے ۔ تو یہ بدبخت بولے کیا انسان ہماری ہدایت پر مامور ہوئے ہیں! کیا بشر ہم کو ہدایت دیں گے ! یہ ہماری زمین، زمین پر چلنے والے لوگ، ہماری طرح کے جسم رکھنے والے لوگ، وہی دو ہاتھ ان کے، وہی دو ٹانگیں ان کی، اور وہی کھانا پینا ان کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے جو ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے، ہماری طرح یہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور کل تک تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کاروبار بھی کرتے تھے ۔ " مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ " یہ عجیب رسول ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔ اور پھر رسالت کا مدعی! یہ ہے وہ سب سے بڑا حجاب جو انسانوں کے سامنے آیا ہے رسالت کے باب میں اور اس کو Exploit کیا ہے اشرار نے۔ وقت کے جو بڑے بڑے چودھری تھے، بڑے بڑے سردار تھے جن کی چودھراہٹ اور سیادت کو خطرہ لاحق ہوتا تھا انبیاء اور رسل کی دعوت سے، وہ اس بات کو سب سے زیادہ ہوا دیتے تھے کہ دیکھو تو سہی ہیہات ہیہات!! یہ لوگ! تمہاری ہی طرح کے انسان، کھانے پینے کی احتیاج رکھنے والے انسان، یہانتک کہ حوائج ضروریہ بھی انہیں لاحق ہیں، یہ لوگ مدعی ہوگئے ہیں رسالت کے. لہٰذا اگر تم اپنے ہی جیسے انسانوں کو رسول مان کر ان کا اتباع کرو گے تو بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔ اسی بشریت کو انہوں نے سب سے زیادہ ہدف بنایا اور یہی بات قبولِ حق میں ان کے لئے سب سے بڑا حجاب بن گئی ۔ " فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا " اسی بات پر انہوں نے

کفر کیا، انکار کر دیا، اعراض کیا۔ پیٹھ پھیر لی۔ بات کو قبول نہ کیا۔ رسول کی دعوت پر لبیک نہ کہا کہ اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا "کیا بشر ہمیں ہدایت کا راستہ دکھائیں گے"! پس جب انہوں نے انکار اور اعراض کی روش اختیار کی تو اللہ نے بھی بے نیازی کی روش اختیار کی اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور حمید فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَی اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ بڑا ہی پیارا انداز ہے یہاں۔ اللہ تو بے نیاز ہے۔ اس کو تو کسی کی احتیاج نہیں، کوئی مانے تو اس کی بادشاہی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ کوئی انکار کر دے تو اس کی شانِ جلالت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، یہ تو اس کا کرم ہے، اس کا فضل ہے۔ اس کی عنایت ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی بھیجے، رسول بھیجے۔ اپنی ہدایت بھیجی، اپنی کتاب نازل کی۔ اب اگر کوئی ناقدری کرے۔ یہاں کَفَرُوْا کا ناقدری ترجمہ اچھا ہوگا۔ انکار کرے، اعراض کرے تو اللہ کی تو کوئی غرض وابستہ نہیں، پس وَاسْتَغْنَی اللّٰہُ ؕ اور اللہ نے بھی اپنی نظرِ عنایت پھیر لی، اپنی نگاہِ التفات کو موڑ لیا اور بے نیازی کی روش اختیار فرمالی اور یہ بے نیازی کا جامہ تو صرف اسی ہی پر راست آتا ہے۔ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ؕ اور اللہ تو ہے ہی غنی و حمید۔ غور کیجئے کہ ان دو آیتوں میں رسالت کا ذکر، رسالت کے لوازم کا ذکر، رسالت کے باب میں انسان نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی ہے اور جس کو چودھریوں نے اور سرداروں نے سب سے زیادہ اچھالا، اس کا ذکر آ گیا اور اللہ تعالیٰ کی دو صفات غنی و حمید کے بیان سے یہ بات بھی واضح کر دی کہ دعوتِ ایمان کے قبول و رد سے اس کی شانِ اعلیٰ وارفع، اس کے جلال اور اس کی بادشاہی میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی واقع ہوتی ہے ـــــ یہاں ایک بات کا اور اضافہ کر لیجئے کہ رسالت کے باب میں ایک گمراہی کا ظہور تو اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی رسالت کو تو اس دلیل سے رد کر دیتے ہیں کہ یہ رسول تو ہمارے جیسا انسان ہے۔ چنانچہ رسالت اور بشریت کو عام طور پر لوگوں نے باہم متناقض سمجھا ہے، اسی مرض کا رسولوں کی امت میں بعد میں ایک دوسری شکل میں ظہور ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تو مرض وہی ہے کہ بشریت و رسالت اور نبوت میں انسانوں نے بُعد و تناقض اور استبعاد محسوس کیا اور اسی سبب سے انہوں نے رسول بشر کی دعوت کو قبول کرنے سے اس دلیل کی بنیاد پر انکار کر دیا کہ یہ رسول تو ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ گویا رسول کا بشر ہونا قبولِ حق میں مانع ہو گیا۔ یہی مرض انبیاء و رسل کی امتوں کے اندر اس طرح ظاہر ہوا کہ انہوں نے نبیوں اور رسولوں کو اس مقامِ بشریت سے اٹھا کر ماورائے بشریت حیثیت دی۔ کسی نے خدا کا بیٹا بنا دیا۔

حضرت مسیحؑ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ کسی نے حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا یا کوئی اور مافوق البشریت کا مقام دے دیا۔ ذہنی مرض ایک ہی ہے، غلطی ایک ہی ہے۔ جس کا ظہور وہاں ایک شکل میں، اور بعد میں امتوں میں ظہور ہوا دوسری شکل میں۔ لہٰذا البشریت کی بنیاد پر رسالت کا انکار اور رسالت کی بنیاد پر بشریت کا انکار بالکل ہم وزن گمراہیاں ہیں۔ ان دونوں میں گمراہی کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں۔ میں شرک کے بیان میں یہاں عرض کر چکا ہوں کہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کی بشریت پر اتنا زور دیا گیا ہے، تاکہ کم از کم یہ امت اس گمراہی سے محفوظ رہے اس لئے کہ پچھلی امتیں اگر گمراہ ہوئیں تو نبی اکرمؐ کے ذریعے سے ان کی گمراہی واضح کر دی گئی اور اس کی اصلاح کر دی گئی۔ لیکن اگر یہ امت بحیثیت مجموعی اس نوع کی کسی گمراہی میں مبتلا ہو جائے تو اب کوئی اور نبی و رسول آنے والے نہیں، پھر اس کی اصلاح کیسے ممکن ہو گی۔ لہٰذا اس حکمت کو جان لیجئے کہ قرآن مجید میں اسی لئے اس قدر تکرار کے ساتھ اور زور کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لہٰذا البشریت کی بنیاد پر رسالت کا انکار، اور رسالت کی بنیاد پر بشریت کا انکار بالکل ہم وزن گمراہیاں ہیں۔ ان دونوں میں گمراہی ہونے کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ظہور مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے۔ لیکن مرض ایک ہے۔ علامات مختلف ہیں ــــ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ ان دو آیتوں میں ایمان بالرسالت کا ذکر ختم ہوا ــــ

اب ایمان بالمعاد، ایمان بالآخرۃ کا بیان شروع ہوتا ہے اور ساتویں آیت اسی مضمون پر مشتمل ہے اس کی اساس تو ایمان باللہ کے ضمن میں ہی قائم کر دی گئی تھی، اب بڑے شرح و بسط کے ساتھ صرف ایک ہی آیت میں بات پوری کر دی گئی۔ فرمایا " زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا " مغالطہ ہو گیا ہے ان کافروں کو کہ ان کو دوبارہ اٹھایا نہیں جائے گا" یہاں لفظ زَعَمَ پر غور کیجئے۔ یہ لفظ ہماری زبان میں بھی مستعمل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کو بڑا زعم ہے یعنی اسے اپنے بارے میں بڑا مغالطہ ہے۔ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔ درآں حالیکہ کچھ ہے نہیں۔ محض ایک خیال خام، ایک بے بنیاد خیال میں مبتلا ہے۔ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ان کافروں کو یہ مغالطہ ہو گیا ہے یہ اس غلطی اور بے بنیاد خیال

میں مبتلا ہو گئے کہ ان کو اٹھایا نہ جائے گا۔ ان کو دوبارہ زندگی نہیں دیجائے گی یا یہ کہ ان کو اٹھایا نہ جا سکے گا۔ ان کو استعجاب ہوتا تھا کہ دوبارہ کیسے پیدا کر دیئے جائیں گے۔ مٹی ہو کر مٹی میں مل جائیں، ہڈیاں گل سڑ جائیں تو پھر کیسے اٹھالئے جائیں گے۔ ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھالئے جائیں گے اور ہم بھی؟ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ۝

(جاری ہے)

بقیہ :- مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی

سورۂ حجرات کی اس آیہ کریمہ (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ) پر گویا کہ ہمارے منتخب نصاب کا جزو ثانی ختم اور جزو ثالث شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ سورۂ والعصر میں بیان شدہ چار لوازم نجات کو اس آیت میں دو اصطلاحات میں جمع کر دیا گیا ہے ایک ایمان حقیقی جو جامع ہے ایمان قولی اور عمل صالح دونوں کا اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا چنانچہ یہیں سے تواصی بالحق کی تفصیلی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

ماہنامہ "حکمت قرآن" کے بعض مستقل خریداروں کی شکایت کے پیش نظر ادارے نے طے کیا ہے کہ آئندہ سے چندہ ختم ہو جانے کی اطلاع پیشگی طور پر دو ماہ قبل دے دی جایا کرے گی۔ تاکہ جو حضرات منی آرڈر بھیجنا چاہیں وہ بروقت منی آرڈر ہمیں ارسال کر دیں۔ اور اس طرح تکلیف دہ صورت نہ پیش آئے کہ آپ کی جانب سے منی آرڈر بھیجا جا چکا ہو لیکن بروقت ہم تک نہ پہنچنے کی وجہ سے ہم یہاں سے رسالہ وی پی بھیج دیں (ادارہ)

مُسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی
کے رہنما اُصول
سُورۂ 'الحجرات' کی روشنی میں

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۂ حجرات مکمل ہے۔ یہ عظیم سورت اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملّی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّت اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستورِ اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کیسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دُنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہو گا۔

اس سورت کو بغرضِ تفہیم تین حصّوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔

پہلا حصّہ مُسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے "اصل الاصول"، یعنی اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی اور ملّت اسلامیہ کی شیرازہ بندی[1] کے اصل قوام یعنی "مرکزِ ملّت" سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست "مادر پدر آزاد" نہیں بلکہ اللہ اور اسکے رسول کے احکام کے 'پابند' ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی "مسلمان" قرار دی جا سکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی

---

[1] ؎ کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے۔ ؎

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل رُوح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی "اصل ثانی" کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ سے محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ) اور ہر اُس قول و فعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (کہ "ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر!")

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ توحید فی الالوہیت کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرز جلی اس کا ذکر موجود ہے لہذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا۔ اس کے بالمقابل اصل ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں ملّت اسلامیہ کے پاس وہ "مرکزی شخصیت" موجود ہے جس سے تمدّن انسانی کی وہ فطری ضرورت بتمام و کمال اور بغیر تصنّع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لئے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بُت تراشنے اور "ہیرو" (HEROES) گھڑنے کا کھکیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو "می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے

دگر"! کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں، لیکن ملّتِ اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اُس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے، (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ" میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت پوری اُمّت مسلمہ سے ہے) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، اُمّت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی "مرکزیت" ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرق اقصیٰ سے لے کر مغرب بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENIETY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیئے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور "علاقائی" شخصیتوں، کو بس ایک حد تک ہی ابھارنا چاہیئے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے "وحدتِ ملت" کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیار قیادت ایک ہی رکھنا چاہیئے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ "عقلی و منطقی" ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی، پہلی پر دستور و قانون کا دار و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اُس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں "محصور" ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہیئت اجتماعی کو ثقافتی یکرنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم اگر بھی جڑے رہتے ہیں

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ مقام رسالت، کے ذکر میں طولِ کلام فی الواقع ع "لذید بود حکایت دراز تر گفتم!" کے مصداق ہے)

دوسرا حصّہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّت اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت و اُلفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف و انتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع تر پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتہً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدِّ باب کرتے ہیں۔

مقدم الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام[1] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل ــ یعنی ا: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمّہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریق ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئتِ اجتماعیہ کو کرنا چاہیئے اور ج: جب وہ گردن جھکا دے تو از سرِ نو عدل و قسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرّر موکّد ذکر خاص طور پر اس لئے ہے کہ جب پوری ہیئتِ اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصّے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

موخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں ان چھ معاشرتی برائیوں سے منع

---

[1] اس سلسلے میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ "کفیٰ بالمرء کذبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے آگے بیان کر دے (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے!)

فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت وعداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہیں جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی ۔ اس لئے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں ۔ ۱ ۔ تمسخر (اس کے سدباب کے لئے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر وقیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲ ۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳ ۔ تنابز بالالقاب، یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد بُرائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے) ۴ ۔ سوءظن (اس لئے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵ ۔ تجسس اور ۶ ۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لئے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا ۔ (اس لئے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا ۔

الغرض ان آٹھ اوامر ونواہی سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے ۔ اس لئے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہرحال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دارومدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے ۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کے استحکام کے لئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت وکردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبت والفت کی استواری بھی لازمی ہے ۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملت اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ واقتدار کے لئے نہیں بلکہ اس لئے

مطلوب ہے کہ وہ ع "ہم تو مِٹتے ہیں کہ دُنیا میں ترا نام رہے!" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصّہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے:

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزّت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزّت و ذلّت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف "تقویٰ" ہے اس لئے کہ پوری نوع انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوّا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن[۱] دشمن بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعۃً انسانی عزّت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوّت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رُخ لائق توجہ ہیں — ایک[۱] : یہ کہ اوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی ان کی جڑ میں جو گمراہی کارفرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تعالی کا جذبہ ہے اور دوسرے[۲] : یہ کہ

---

[۱] چنانچہ ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات و اخوّت کے نہایت اونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم ، فداہ ابی و امی) کا کارنامہ ہے۔

اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہل ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیار عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری نوع انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ الٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" سے ہوا (واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورہ حجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنیٰ سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اس کا خارجی ظہور ہے، لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کرلے اسے "اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی"، ایک انگریزی مقولے[1] کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے؛ بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفی کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت

[1] 'CALL THE ROSE BY ANY NAME: IT WILL SMELL AS SWEET'

واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے، اس لئے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویّے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقْرَارٌ بِاللِّسَان" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہو گئی

ایک[1]: یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کی دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق۔ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے (جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حُسنیٰ "غفورٌ" اور "رحیمٌ" سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امت مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی یہ کہ انسان ہدایت آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لئے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جد و جہد میں تن من دھن سب کو قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں

---

[1] واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

ڈاکٹر عبدالخالق
صدر شعبۂ فلسفہ

خودی اور تعمیرِ معاشرہ

فرد اور معاشرے کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ افراد کے بغیر معاشرے کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ بہر حال انہی پر مشتمل ہے۔ وہ خوبیاں جو فرد کی خودی کو استحکام عطا کرتی ہیں، معاشرے کو بھی مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ضروری ہیں اور خودی کو مضمحل کرنے والے عناصر ملّت کے شیرازے کو بھی بکھیر کر روبہ زوال کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک فرد کو جو حقوق حاصل ہیں، اور جو فرائض اس کے منصب سے وابستہ ہیں، ان کی ادائیگی معاشرے کے بغیر ناممکن ہے بلکہ دوسرے افراد کے سامنے جواب دہی کا احساس فرد کو خود اپنی تکمیل کے مختلف مراحل طے کرنے کے لیے تحریک مہیا کرتا ہے۔ اس بات کا تعیّن کرنے کے لیے کہ ایک شخص کی خودی استحکام کے کس مرحلے میں ہے ، دوسروں کا نقطۂ نظر بہت اہمیت رکھتا ہے۔

جاوید نامہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

زندۂ یا مُردۂ یا جان بلب ۔۔۔ از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہد اوّل شعورِ خویشتن ! ۔۔۔ خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہد ثانی شعورِ دیگرے ۔۔۔ خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہد ثالث شعورِ ذاتِ حق ۔۔۔ خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

یعنی خودی کی تکمیل کا پہلا معیار میری اپنی ذات ہے اور وہ یوں کہ میں اپنے اعمال کو اعلیٰ مقاصد سے کس حد تک ہم آہنگ کر سکا ہوں۔ اس کا دوسرا معیار میرا معاشرہ ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس کی ذمہ داری قبول کرتے

کے لیے میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ معاشرتی زندگی سے متعلق مختلف واقعات کی جانب جو میرا مثبت یا منفی رجحان ہے وہ مجھے ان واقعات کا ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔ تیسرا اور اعلیٰ ترین معیار شعورِ ذاتِ حق ہے۔ اپنی ذات اور معاشرے کے علاوہ خود خدائے بزرگ و برتر کے حضور میرے اندر جوابدہی کا بھرپور احساس ہونا چاہیئے۔ اگر یہ احساس پوری قوت کے ساتھ موجود ہو تو خودی میں ع

ترعین ذات می نگری و تبسّمی

کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرہ فرد کی نفسیاتی ضرورت بھی ہے۔ اسی بنا پر انسان کو SOCIAL ANIMAL کا نام دیا گیا ہے۔ فطرت انسانی میں جن جبلی خواہشات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک اجتماع پسندی کی خواہش ہے چنانچہ معاشرے سے علیحدہ ہو کر زندگی بسر کرنے کا امکان سراسر خلافِ فطرت ہے

خودی کا موجودہ تصوّر بہت حد تک علامہ اقبال کا مرہونِ منت ہے۔ علامہ سے پہلے مسلمانوں میں اور بالخصوص بعض مسلمان صوفیاء کے ہاں کچھ اس نوعیت کا فلسفہ رائج تھا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کو مٹا دینا چاہیئے کہ بیج خاک میں مل کر ہی خوبصورت پھول کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ علامہ نے نہایت زوردار انداز میں اثباتِ ذات کا نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے تکبر، نخوت اور خود پسندی کے بجائے خودداری، عزتِ نفس، استکمالِ ذات وغیرہ کے الفاظ کو خودی کا مترادف قرار دیا اور اسے شرف و کمال کی انتہائی منزلوں تک پہنچا دیا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال سے پہلے اور خود ان کے اپنے دور میں بھی ان کے تصورِ خودی سے ملتے جلتے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً مشہور جرمن فلسفی نٹشے نے اپنے فکر میں شعورِ ذات کی اہمیت پر اصرار کرتے ہوئے اسے معروضی حقائق کے مشاہدے کی بنیاد قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک خود شعوری ہی وہ عمل ہے جو مادی کائنات کی

جبریت اور انسان کی آزادیٔ ارادہ کے مابین ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتا ہے۔ شعور سے ہستی اخذ کی جا سکتی ہے مگر ہستی سے شعور اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال کے ہم عصر مغربی مفکرین میں ممتاز اور سربرآوردہ ماہر نفسیات ولیم میکڈوگل کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے اپنی کتاب AN INTRODUCTION TO SOCIAL PSYCHOLOGY میں خودی کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک خودی کی آفرینش اصلاً چند ایک فطری تقاضوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ INSTINCTS یا جبلتوں کا نام دیتا ہے۔ ان جبلتوں کی تسکین بقائے ذات اور افزائشِ نسل کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ابتدا میں ان جبلتوں کے مابین نظم و ضبط نہیں ہوتا۔ اگر انہیں کسی انداز سے منظم نہ کیا جا سکے تو زندگی نچلے درجے کے حیوانات کی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ انسانی درجے پر زندہ رہنے کے لیے جبلتوں کی تنظیم و ترتیب ناگزیر ہے۔ اس ترتیب کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب جبلتیں مختلف اشیاء، افراد یا واقعات کے گرد جمع ہونے لگتی ہیں اور اس طرح جذبات SENTIMENTS معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً کچھ جبلتیں والدین سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ کچھ مذہب سے، کچھ ملک و ملت سے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس سطح پر بدنظمی پورے طور پر ختم نہیں ہوتی کیونکہ ایک جبلت کئی جذبات سے متعلق ہو سکتی ہے۔ اور یوں ایک جذبے کے تقاضے دوسرے جذبے کے تقاضوں سے متصادم ہو سکتے ہیں۔ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے کچھ جذبات مقتدر حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور باقی ان کے تحت آ جاتے ہیں۔ ایک شخص کی زندگی میں مقتدر جذبات کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر وہ بہت کم بھی ہوں تو ان کے مابین تناقض کا امکان باقی رہتا ہے۔ اس امکان کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایک جذبہ مقتدرِ اعلیٰ کا کردار ادا کر سکے تاکہ اس کے مقابلے میں باقی سب جذبات کی حیثیت ثانوی ہو۔ میکڈوگل کے نزدیک ہر مکمل انسان میں ایسا جذبہ موجود ہوتا ہے اور یہ ہے جذبہ احترامِ نفس SENTIMENT OF SELF-REGARD یہی جذبہ اقبال کے تصورِ خودی کی اساس ہے۔ تاہم میکڈوگل کا نقطہ نظر سراسر نفسیاتی ہے۔ اس کے تصورِ خودی میں ہمیں ان مذہبی اور اخلاقی اقدار کا سراغ نہیں ملتا جن پر اقبال نے

بہت زیادہ زور دیا۔ اقبال نے جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی اور خودی کی تکمیل کا پیمانہ یہ مقرر کیا ہے کہ وہ کس حد تک ان اقدار کا اکتساب کر سکی ہے۔ اللہ کی ذات مطلق اور انتہائی مستحکم اور حیّ و قیوّم ہے۔ انسان کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی خودی کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور پائیدار کرنے کا عمل جاری رکھے۔

مغرب کے ان مدرسہ ہائے فکر میں جنہوں نے فرد کی اہمیت اور فرد معتبر کے علائم و رموز واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے وجودیت کا نام سرفہرست ہے۔ اس ضمن میں وجودی مفکرین نے بعض معاصر فکری رویوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ان میں سے ایک رویہ ہیگل کا فلسفہ وجود مطلق تھا۔ جس میں آفاقی شعور، کائناتی عقل اور بالعموم نظام آفرینی پر تواصرار تھا جس سے بظاہر ہر امر واقعہ کی توجیہہ بھی مہیا ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں فرد کی انفرادیت اور اس کی کما حقہٗ اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مشہور وجودی مفکر کرکیگار کے نزدیک آفاقی شعور کی سلطنت میں منفرد اور متشخص وجود قائم رکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا یورپ کے ایک چھوٹے سے نقشے کی مدد اور ہدایت سے ڈنمارک میں سفر کرنا جبکہ اس نقشے میں ڈنمارک کا طول و عرض ایک نقطے سے زیادہ نہ ہو۔ اسی طرح مختلف وجودی مفکرین نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں پائے جانے والے متشدّد رویّے پر تنقید کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سائنسی فکر میں معروضیت پر جس پیرائے میں اصرار کیا جا رہا ہے اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر زندگی کے ہر شعبے میں مشینوں کی جس طرح فرمانروائی تسلیم کی جا رہی ہے اس نے فرد کی موضوعیت اور داخلی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ فرد کے سارے وظیفے آہستہ آہستہ مشینوں کو منتقل کیے جا رہے ہیں اور اس میں ایک شدید قسم کی محرومی اور مغائرت کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ اگرچہ علمِ نفسیات نے فرد کے داخلی پہلو کو موضوع بحث بنایا لیکن عقلیت محض کے طریق کار اور تجزیاتی انداز فکر کی وجہ سے اس کے نتائج اور فیصلے انسان کی کلیت کو محفوظ نہ رکھ سکے اور اسے اپنے بارے میں مزید شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا۔ کائنات کے مرکزی وجود اور عملِ تخلیق کے شاہکار کی حیثیت سے انسان کے مقام و مرتبے کو بحال کرنے کے لیے وجودی مفکرین نے بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے اس کی آزادیٔ ارادہ اور بے پناہ احساس ذمہ داری

پر خصوصیت سے زور دیا۔ ان کے نزدیک عملِ انتخاب کی صلاحیت ہی کی بدولت اسے اپنی انفرادیت کا مکمل شعور حاصل ہوتا ہے۔ سارتر کا مشہور مقولہ ہے "MAN IS CONDEMNED TO BE FREE"۔ بعض مفکرین کو شکایت ہے کہ اخلاقی زندگی میں آزادئ ارادہ کے ساتھ ساتھ جو ایک اعلیٰ ترین اخلاقی نصب العین کا تصور بھی موجود ہوتا ہے وہ وجودی مفکرین کے ہاں نہیں ملتا۔ اس تصور کے بغیر آزادی اور ذمہ داری کی بات بے معنی نہ سہی نامکمل ضرور ہے۔ البتہ ایک پہلو سے وجودیت پر یہ تنقید صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ خودی کے اعلیٰ ترین مراحل میں ایک شخص تخلیقی کردار ادا کرتے ہوئے اپنے مقاصد کا خود تعین کرتا ہے۔ مروّجہ اخلاقی قواعد وضوابط کی پابندی اس کے اندر گھٹن کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اور بلند تر اخلاقی اور روحانی درجات حاصل کرنے میں اس کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وجودیوں کے ہاں انسان کی داخلیت پر جو اصرار پایا جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے ترک علائق اور رہبانیت کا سبق دیا ہے۔ خود شعوری تو ایک صحت مند سماجی نقطۂ نظر کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ موضوعیت / داخلیت کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس کی مدد سے ایک بالاتر، غیر جانبدار اور بے لاگ رویّہ اپنایا جا سکتا ہے جو رائج الوقت تہذیب وثقافت کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ثقافت کے اس شعور کو اصلاح و تعمیرِ معاشرہ کی اصل قرار دینا چاہیئے۔

قرآن حکیم میں نفس انسانی کے جو تین ارتقائی مدارج بیان کیے گئے ہیں انہیں اس بحث سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ پہلا مرحلہ نفس امارہ کا ہے۔ نفس جو جسم اور روح کے دو مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے، ابتدا میں صرف جسم کی نشوونما پر توجہ دیتا ہے۔ وہ جسمانی احتیاجات وخواہشات میں منہمک رہتا ہے۔ اگر بدنی لذّت اس کا منتہا ومقصود بن جائیں اور اگر ان جذبات سے ترفع کرنے کا جذبہ اس کے اندر مفقود ہو جائے تو وہ برائی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نفس کی اسی حالت کے متعلق ارشاد ہے: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔ دوسرا مرحلہ نفس لوّامہ کا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں نفس روح کے نشوونما کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے۔ نفس کا ایک پہلو جسم کا ساتھ دیتا ہے اور اسے برائی کی ترغیب دیتا ہے اور دوسرا پہلو روح کا ساتھ

دیتا ہے اور اسے برائی سے روکتا ہے۔ اگر یہ کشمکش مثبت انداز میں آگے بڑھے تو بالآخر روح جسم کو اپنے تابع کر لیتی ہے اور نفس وہی کچھ کرتا ہے جو روح چاہتی ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کی منزل ہے جہاں اس کی اپنے IDEAL سے مکمل ہم آہنگی ہو جاتی ہے خودی اور خود شناسی کی یہی وہ منزل ہے جہاں ایک شخص اصلاحِ معاشرہ کا کام صحیح خطوط پر سرانجام دے سکتا ہے۔ مکمل اطمینانِ قلب حاصل کرنے سے اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو ایک عظیم ریفارمر میں ہونی چاہئیں مثلاً صداقت۔ جرأت و بے باکی، قول و فعل میں مطابقت وغیرہ۔ ایسے انسان کی صحبت ہی بسا اوقات دوسرے افراد میں اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

تاہم اس درجہ پر فائز شخص سے اکتساب فیض کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا جائے اور اس کے ساتھ COMMITMENT کا جذبہ ہمارے اندر موجود ہو۔ قرآن حکیم آنحضرتؐ کے لیے اسی قسم کا رویہ اپنانے پر زور دیتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"نہیں، اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر تسلیم خم کر لیں۔" (سورۃ النساء آیہ ۶۵)

اسلامی تصوف میں فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسول کے جو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان کا ہمارے ہاں بدقسمتی سے بہت غلط استعمال کیا گیا ہے اور تصوف کی صحیح صورت کو مسخ کرنے میں ان کا خاصا عمل دخل ہے۔ اصولی طور پر ایک روحانی پیشوا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایات حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تعرض اور تشکیک کے رجحان کو معطل رکھا جائے۔ ہر معاملے میں سوالات اٹھانے کی عادت ایک تو فرد کی اپنی داخلی بے اطمینانی کی نشاندہی کرتی ہے اور دوسرے ممکن ہے اس سے فکر کی نت نئی راہیں تو کشادہ ہوتی ہوں لیکن یقین اور ایمان کی

دولت میسر نہیں آتی۔

سائنسی علوم کی ترویج و ترقی کو کسی بھی جدید معاشرے کی ثقافت کا لازمی حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان علوم کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ ان میں فقط معروضیت پائی جاتی ہے اور ان کا سائنسدان کی داخلی کیفیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک شخص کا مذہب، اس کے نظریات و عقائد، جذبات و احساسات کچھ بھی ہوں اسے حقائق کا بہرحال ویسا ہی مشاہدہ کرنا ہوتا ہے جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں۔ لیکن اس بات کو ہر اعتبار سے صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ہم انسان دوستی اور دیگر اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار سے بہرہ ور ہوں گے تو سائنس اور ٹیکنالوجی سے مثبت نتائج اخذ کرسکیں گے۔ بصورت دیگر سائنسی علم اور فنی و تکنیکی مہارت سے جو بے پناہ طاقت حاصل ہوتی ہے اسے تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسلام ہمیں انہی اقدار کا شعور دیتا ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں فطرت کے مظاہر اور اس میں کارفرما قوانین کے مشاہدے اور مطالعے کی ترغیب دی ہے وہاں اس حقیقت پر بھی اصرار کیا ہے کہ ان مظاہر میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے تجربی علوم کے ساتھ ساتھ اخلاق اللہ کا اکتساب بھی فرض منصبی کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ اب چونکہ انسان کو اللہ کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس کے اندر اسی کی روح جاری و ساری ہے۔ اللہ کی عادات کا تخلق انسان کی خود اپنی IDEAL NATURE کی شناخت کے مترادف ہے۔ اس لحاظ سے اخلاقی زندگی کا منتہا و مقصود اور سائنسی تجربیت کا ناگزیر معاون خودی ہی کی CONSUMMATION اور تکمیل ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سیرۃ نبویؐ
قرآن حکیم کی روشنی میں

محمد رفیق چودھری

تعارف اور ابتدائی زندگی

آپ کا اسم گرامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے[1]۔ آپؐ اللہ کے بندے[2] اس کے رسول[3] اور آخری نبی ہیں[4]۔ عرب کے شہر مکہ میں آپؐ کی ولادت ہوئی[5]۔ آپؐ کی ولادت سے قبل ہی آپؐ کے والد ماجد دنیا سے رخصت ہو چکے تھے[6]۔ آپؐ عربی النسل تھے، اور مادری زبان عربی تھی[7]۔ آپؐ کا سلسلۂ نسب حضرت اسمٰعیل اور حضرت ابراہیم علیہما السلام سے جا ملتا ہے[8]۔ آپؐ اُمّی تھے اس لئے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے[9]۔ ابتدائی دور بڑی تنگدستی میں گزرا۔ اگرچہ بعد میں خوشحالی بھی آئی[10]۔

بعثت

حضورؐ جوان ہوئے تو ہدایت کے متلاشی تھے[11]۔ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپؐ پر میرے نزول کا آغاز ہوا[12]۔

---

[1] آلِ عمران ۱۴۴، الاحزاب ۴۰، محمد ۲، الفتح ۲۹ [2] بنی اسرائیل ۱، الکہف ۱، الحدید ۹، الجن ۱۹، النجم ۱۰ - [3] آلِ عمران ۱۶۴، المائدہ ۶۷، الاحزاب ۲۱، ۴۰، الفتح ۲۹، الحشر ۷ - ([4]) الاحزاب ۴۰ [5] البلد ۲، ابراہیم ۳۵، آل عمران ۹۶، التین ۳، الشوریٰ ۷ ([6]) الضحیٰ ۶ - [7] الدخان ۵۸، الجمعہ ۲، الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸، مریم ۹۷، الشوریٰ ۷ [8] البقرہ ۱۲۸، ۱۲۹ [9] الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸، الجمعہ ۲، العنکبوت ۴۸ - ([10]) الضحیٰ ۸ - ([11]) الضحیٰ ۷، ([12]) الشوریٰ ۷، الفرقان ۱، الانعام ۹۲، یونس ۲، بنی اسرائیل ۱۰۵ -

ابتدا میں آپؐ نے میرے حفظ کے لئے ذرا عجلت سے کام لیا مگر اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا اور میرے محفوظ ہو جانے کے بارے میں پورا اطمینان دلا دیا[۱۳]۔ آپؐ کی آمد اور نبوت کے بارے میں تورات و انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کی صورت میں پہلے سے پیشگوئیاں موجود تھیں[۱۴]۔ آپؐ کی بعثت سلسلۂ نبوت کے ایک طویل عرصۂ تعطل کے بعد ظہور میں آئی[۱۵]

فرائض اللہ تعالےٰ کے رسول ہونے کی حیثیت سے آپؐ کی ذمہ داریاں یہ تھیں :

۲ - اہلِ ایمان کا تزکیۂ نفس کرنا[۱۶]

۱ - لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا[۱۷]

۳ - ان کو اللہ کی کتاب سکھانا اور اس کے احکام سمجھانا[۱۸]

۴ - اُن کو حکمت و بصیرت سے آگاہ کرنا[۱۹]

۵ - میری تشریح و تفسیر کرنا[۲۰]

۶ - انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے ایک عملی اور مثالی نمونہ پیش کرنا[۲۱]

۷ - اصلِ دین کے بارے میں ان تمام اختلافات کی حقیقت واضح کرنا جو پہلے انبیاء کرام کی اُمتوں کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں تمام آمیزشوں کو الگ کرنا، اُلجھنوں کو دور کرنا، گمراہی کے پردوں کو ہٹانا اور راہِ ہدایت کو اُجالنا[۲۲]

---

[۱۳] طٰہٰ ۱۱۴، القیامہ ۱۶ تا ۱۹ - [۱۴] الاعراف ۱۵۷، الصف ۶، البقرہ ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲ - [۱۵] المائدہ ۱۹ [۱۶] آل عمران ۱۶۴، البقرہ ۱۵۱، الجمعہ ۲، النمل ۹۲، الطلاق ۱۱، [۱۷] آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲، البقرہ ۱۵۱، [۱۸] آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲، البقرہ ۱۵۱ [۱۹] آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲، البقرہ ۱۵۱ - [۲۰] النحل ۴۴، ۶۴، آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲، البقرہ ۱۵۱ - [۲۱] الاحزاب ۲۱، الحشر ۷ - [۲۲] المائدہ ۱۵، ۱۶، النحل ۶۳، ۶۴ -

۸ - دنیا میں حق کا فکری اور عملی گواہ بن کر رہنا[۲۳]

۹ - لوگوں کو غیر اللہ کی پابندیوں سے آزاد کرانا، اُن کو غلط رسم و رواج کی بوجھل زنجیروں سے نجات دلانا، حلال و حرام کی ٹھیک ٹھیک حدبندی کرنا[۲۴]

۱۰ - لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا۔[۲۵]

۱۱ - اللہ کے دین کو انسانی زندگی کے ہر گوشے میں جاری و ساری اور غالب کر دینا[۲۶]

نبوّت کے دلائل

آپؐ کی نبوّت کے چند دلائل یہ ہیں:

۱ - آپؐ کی نبوّت کی سب سے بڑی دلیل (معجزہ) یہ ہی خود ہُوں[۲۷]۔ میری مثل کوئی کلام پیش نہیں کیا جا سکتا[۲۸]

۲ - آپؐ کوئی نئے نبی نہیں تھے[۲۹] بلکہ پہلے تمام انبیاءِ کرام کی تصدیق کرتے تھے[۳۰]

۳ - آپؐ اُمّی تھے اور کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ عمر کا ایک بڑا حصّہ گزارنے کے بعد آپؐ نے یکایک عظیم الشّان علم و حکمت کا درس دینا شروع کر دیا[۳۱]

۴ - لوگ آپؐ کو پہلے سے صادق اور امین کی حیثیت سے جانتے تھے[۳۲]

دعوت و تبلیغ

منصبِ نبوّت پر فائز ہونے کے فوراً بعد آپؐ نے لوگوں کو دعوتِ حق دینے کا آغاز کر دیا[۳۳] ابتدا میں آپؐ نے اپنے

---

[۲۳] البقرہ ۱۴۳، النساء ۴۱، النحل ۸۹، الحج ۷۸ - [۲۴] الاعراف ۱۵۷ - [۲۵] الاعراف ۱۵۷،
[۲۶] التوبہ ۳۳، الفتح ۲۸، الصف ۹ - [۲۷] العنکبوت ۵۰، ۵۱، بنی اسرائیل ۱۰۵، ۱۰۶، البقرہ ۲۳، ہود ۱۲، ۱۳ - [۲۸] البقرہ ۲۳، یونس ۳۸، ہود ۱۳، الطور ۳۴ [۲۹] الاحقاف ۹، النساء ۱۶۳، النحل ۳۶، النجم ۵۶، الشوریٰ ۱۳ - [۳۰] البقرہ ۱۰۱، آلِ عمران ۸۱، الصف ۶ - [۳۱] الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸، العنکبوت ۴۸، الجمعہ ۲ [۳۲] الاحزاب ۲۲، یٰس ۵۲، آل عمران ۱۶۱ -
[۳۳] الشوریٰ ۷، الفرقان ۱، الانعام ۹۲، یونس ۲، بنی اسرائیل ۱۰۵

خاندان — بنو ہاشم — کو دعوتِ حق کا پیغام سُنایا[۳۴] - دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک خفیہ طور پر جاری رہا - پھر اس کے بعد اہلِ مکّہ کو علانیہ طور پر پیغامِ حق سنایا[۳۵]-

کشمکش حق و باطل

آپؐ کی دعوت کے نتیجے میں حق و باطل کی ایک کشمکش برپا ہو گئی - کچھ لوگ آپ پر ایمان لے آئے مگر قوم کی اکثریت نے آپ کو جھٹلایا اور اللہ کا رسول ماننے سے انکار کر دیا[۳۶] - کفّار و مُشرکین کے انکار کی اصل وجہ خواہش پرستی تھی - وہ اپنی خواہشِ نفس کے خلاف کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے[۳۷] ابُولہب نامی شخص نے آپؐ کی سخت مخالفت کی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ	ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ
وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ	برباد ہوا - نہ اس کا مال اسکے
مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝	کام آیا نہ اس کی کمائی - وہ جلد
سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ	بھڑکتی آگ میں پڑے گا اور
لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ	اس کی وہ بیوی بھی جو ایندھن
حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ فِيْ	ڈھونے والی ہے جس کے
جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝	گلے میں بٹی ہوئی رسّی پڑی ہوگی -

مخالفت اور اعتراضات

کفّار و مشرکین نے آپؐ کے خلاف مخالفت کا منفی محاذ قائم کر دیا[۳۹] - آپؐ کا مذاق اڑایا،[۴۰]

---

[۳۴] الشعراء ۲۱۴ [۳۵] الحجر ۹۴ [۳۶] الانعام ۶۶، ۵۷، ۳۳، ۳۴، ۱۴، آلِ عمران ۱۸۴، العنکبوت ۱۸، فاطر ۴، ۲۵، الفرقان، [۳۷] الانعام ۱۵۱، القصص ۵۰، الروم ۲۹، محمد ۱۶، القمر ۳ - [۳۸] اللہب ۱ تا ۵ - [۳۹] الفرقان ۳۱ - [۴۰] الفرقان ۴۱، الانبیاء ۳۶، الحجر ۹۵، الانعام ۱۰، الصافات ۱۲ تا ۱۴ -

پھبتیاں کسیں[۴۱]، کٹ حجتیاں کیں[۴۲] اور اعتراضات و الزامات کی بوچھاڑ کر دی[۴۳]۔ آپؐ کو جادوگر[۴۴]، شاعر[۴۵]، مجنوں[۴۶]، سحر زدہ اور کاہن[۴۸] کہا گیا۔ آپؐ کو سخن ساز ہونے کا الزام دیا[۴۹]۔ ابتر۔ بے اولاد ہونے کا طعنہ دیا[۵۰]۔ اُذن۔ کان کا کچا۔ ——— کہا[۵۱]۔ جوشِ مخالفت میں یہاں تک کہا کہ آپؐ پر اللہ کا کوئی کلام وغیرہ نازل نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کچھ ان کا اپنا ایجاد کردہ اور من گھڑت ہے[۵۲]۔

میں نے ان سب لغو اعتراضات اور الزامات کے جا بجا جوابات دیئے ہیں[۵۳]۔

کفارِ مکہ نے آپؐ سے عجیب و غریب معجزے طلب کئے اور کہا کہ "ہم اُس وقت تک آپؐ کی بات نہ مانیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دیں یا آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور آپ اس میں نہریں جاری کر دیں۔ یا جیسا کہ آپؐ کا دعوے ہے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دیں۔ یا اللہ اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئیں۔ یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور آپ کے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ آپ ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لائیں جسے ہم پڑھ سکیں[۵۴]۔

---

[۴۱] الفرقان ۴، الانعام ۲۵، ۵۳، النحل ۲۴، [۴۲] الفرقان ۲۱، یونس ۲۰، طٰہٰ ۱۳۳، ہود ۱۹، [۴۳] آل عمران ۱۸۴، الانعام ۵۷، ۱۴۷، فاطر ۴، یونس ۴۱، الحج ۴۲، [۴۴] ص ۴، یونس ۲، الانبیاء ۳، المدثر ۲۴، ہود ۷۔ [۴۵] الانبیاء ۵، الطور ۳۰، الحاقہ ۴۱، یٰسٓ ۶۹۔ [۴۶] الحجر ۶، الطور ۲۹، القلم ۲، ۵۱، التکویر ۲۲، الاعراف ۱۸۴۔ [۴۸] الحاقہ ۴۲، الطور ۲۹، [۴۹] الحاقہ ۴۴، [۵۰] الکوثر ۳۔ [۵۱] التوبہ ۶۱۔ [۵۲] النحل ۱۰۱، ہود ۱۳، الفرقان ۴، السجدہ ۳، الاحقاف ۸۔ [۵۳] الاعراف ۱۸۴، یٰسٓ ۶۹، الحاقہ ۴۱، الطور ۴۲، السجدہ ۳۔ [۵۴] بنی اسرائیل ۹۰ تا ۹۳۔ [۴۷] الفرقان ۸، بنی اسرائیل ۴۷

مخالفینِ حق آپ کی دعوت کو سُننے اور سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے، بلکہ جب آپ اُن کو میری آیات سُناتے تو وہ شور وغل مچاتے اور ہنگامہ آرائی کرتے تاکہ اس جذباتی اور ہیجانی فضا میں کسی کو سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس حربے اور شرارت کے ذریعے وہ لوگ اپنے محاذ کو مضبوط بنانا چاہتے تھے[۵۵]

کبھی طنزیہ طور پر آپ سے پُوچھتے کہ "قیامت کب آئے گی[۵۶]؟ کبھی طنزیہ دُعا کے طور پر کہتے کہ "اے اللہ! اگر یہ واقعی حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے۔ یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لے آ[۵۷]۔ کبھی یہ اعتراض کیا جاتا کہ "اس نبی پر کوئی خزانہ نہیں اُترا[۵۸]" کبھی کہا جاتا "اس کے ساتھ کوئی فرشتہ نظر نہیں آتا[۵۹]" ایک دفعہ کافی عرصہ تک وحیٔ الٰہی کا سلسلہ بند رہا تو کفار نے یہ مشہور کر دیا کہ آپ کے آپکا ربّ ناراض ہو گیا ہے اور اُس نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے[۶۰]

اس طوفانِ بدتمیزی میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدزبانیوں کے مقابلے میں اعراض فرماتے رہے، اظہارِ حق کا فریضہ ادا کرتے رہے اور بداخلاق لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے رہے[۶۱]۔ آپ کی زبردست خواہش تھی کہ سب لوگ آپ پر ایمان لائیں اور ہدایت پائیں، اس کے لئے آپ کُڑھتے اور غمزدہ ہوتے تھے[۶۲]

میں نے کفار کے پراپیگنڈا کے مقابل میں حضورؐ کی اصل حیثیت کو بے نقاب اور واضح کرنے کے لئے آپ کو بہت سے القابات سے نوازا ہے تاکہ عام

---

[۵۵] اعراف ۱۸۴، یٰسٓ ۶۹، الحاقہ ۴۱، الطور ۲۹، السجدہ ۳۔ [۵۶] بنی اسرائیل ۹۰ تا ۹۳، [۵۷] حٰمٓ السجدہ ۲۶ [۵۸] الاعراف ۱۸۷، الاحزاب ۶۳، النازعات ۴۲ [۵۹] الانفال ۳۲ [۶۰] ہود ۱۲۔ [۶۱] ہود ۱۲۔ [۶۲] الضحیٰ ۱ تا ۳ [۶۳] الاعراف ۱۹۹ [۶۴] الکہف ۶، الشعراء ۳، النحل ۱۲۷، النمل، الانعام ۳۳۔

لوگ آپ کے بارے میں صحیح تصور قائم کر سکیں۔ میں نے بیان کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے[۶۳] اُس کے رسول[۶۴] اور نبی ہیں[۶۵]، وہ نذیر[۶۶]، بشیر[۶۷]، احمد[۶۸]، مبشر[۶۹] (خوشخبری دینے والے)، مذکر[۷۰] (دین کی یاددہانی کرانے والے)، مُنذِر[۷۱] (خبردار کرنے والے)، داعی الی اللہ[۷۲] (اللہ کی طرف دعوت دینے والے)، مُزمِّل[۷۳]، مدثر[۷۴]، خاتم النبیین[۷۵] (آخری نبی)، ہادی[۷۶] (راہ ہدایت دکھانے والے) ہیں، رحمۃ للعالمین[۷۷] (سارے جہان کے لئے رحمت)، ہدایت کے روشن چراغ، حق کے گواہ[۷۸]، اُمت کے خیرخواہ اور غمگسار ہیں[۷۹]۔ مسلمانوں کے لئے رؤف[۸۰] (شفقت اور مہربانی فرمانے والے)، اور رحیم[۸۱] ہیں۔

آپ کی دعوت آہستہ آہستہ پورے عرب کو متاثر کر رہی تھی جس سے اسلام کا محاذ مضبوط ہو رہا تھا اور کفر کی قوت میں کمی آ رہی[۸۲] تھی۔ مگر اس کے باوصف اہلِ باطل نہایت سرگرم عمل تھے۔ انہوں نے دعوتِ حق سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے فنونِ لطیفہ کا محاذ کھولا، دل بہلاوے اور تفریح کا سامان مہیا کیا، راگ رنگ اور کھیل تماشے کا انتظام کیا اور دلچسپ افسانوی قصوں کا بیان شروع کر دیا[۸۳]۔ کفار نے آپ سے سودے بازی اور سمجھوتے کی کوششیں بھی کیں اور کہا کہ "اس

---

[۶۳] الحدید ۹۔ الجن ۱۹، بنی اسرائیل ۱، الکہف النجم ۱۰، [۶۴] آل عمران ۱۶۴، المائدہ ۶۷، الاحزاب ۲۱، ۴۰، الفتح ۲۹، الحشر، [۶۵] آلِ عمران ۶۸، الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸، توبہ ۷۳، الممتحنہ ۱۲، التحریم ۱۔ [۶۶] الاعراف ۱۸۸، فاطر ۲۴، سبا ۲۸، البقرہ ۱۹، المائدہ ۱۹، [۶۷] الاعراف ۱۸۸، فاطر ۲۴، سبا ۲۸، البقرہ ۱۱۹، المائدہ ۱۹۔ [۶۸] الصف ۶ [۶۹] الفرقان ۵۶، الفتح ۹، بنی اسرائیل ۱۰۵، الاحزاب ۴۶۔ [۷۰] الغاشیہ ۲۱ [۷۱] الرعد۔ [۷۲] الاحزاب ۴۶ [۷۳] المزمل ۱۔ [۷۴] المدثر ۱۔ [۷۵] الاحزاب ۴۰۔ [۷۶] الشوریٰ ۵۲۔ [۷۷] الانبیاء ۱۰۷ [۷۸] الاحزاب ۴۶۔ [۷۹] النحل ۸۹۔ البقرہ ۱۴۳، النساء ۴۱، الحج ۷۸، [۸۰] التوبہ ۱۲۸ [۸۱] التوبہ ۱۲۸ [۸۲] التوبہ ۱۲۸۔ [۸۳] الرعد ۴۱۔ الانبیاء ۴۴۔ [۸۴] لقمان ۶۔

قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آیئے یا اسی میں ہمارے حسبِ منشاء ترمیم کر لیجئے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ "ان لوگوں سے کہہ دیجئے مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کردوں۔ میں تو بس اُسی وحی کا پیرو ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے روزِ قیامت کے عذاب کا ڈر ہے[85]۔" پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کفّار کی ان سوئے بازیوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے اور ان کی چالوں سے بچنے کی تلقین کی اور اپنی طرف سے حفاظت کا پورا اطمینان دلایا[86]۔

مخالفینِ حق نے حضورؐ کو غیر اللہ کا خوف دلانے کی بھی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں آپؐ کو ثابت قدم رکھا اور ہر صورت میں آپؐ کو تحفّظ کا یقین دلایا[87]۔

اہلِ کتاب - یہود و نصاریٰ - نے بھی آپ کی تکذیب کی اور آپ کے مخالف ہو گئے حالانکہ یہ لوگ آپ کو برحق جانتے تھے[88]۔ ان کے انکار کے وجوہ میں حَسَد، ضِد اور خواہش پرستی شامل تھی[89]۔

اذیّت رسانی کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا اور سخت اذیتوں میں مبتلا کیا[90]۔ اہلِ ایمان نہایت کمزور اور بے سرو سامان تھے اور دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے[91]۔

واقعۂ معراج آپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ اسراء یعنی معراج ہے۔ اس میں اللہ ربّ العالمین اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[85] یونس ۱۵ - [86] بنی اسرائیل ۷۴، ۷۵، ہود ۱۱۲، ۱۱۳ - [87] الزمر ۳۶ [88] البقرہ ۸۹، ۱۰۹، ۱۴۴، ۱۴۶، آل عمران ۸۶، ۹۹، الانعام ۱۱۴، الرعد ۴۳ - [89] القصص ۵۰، آلِ عمران ۱۹، البقرہ، ۱۰۹، النساء ۵۴ - [90] الاعراف ۱۸۸، التوبہ ۶۱ [91] الانفال ۲۶

کو راتوں رات مسجد حرام سے لے گیا اور مسجد اقصیٰ کی بابرکت فضا کی سیر کرائی۔ اس دوران میں کچھ خاص نشانیوں کا مشاہدہ بھی کرایا[۹۲]۔

ہجرت

کفارِ مکہ نے آپ کو قید کرنے یا جلاوطن یا قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا[۹۳]۔ جس کے نتیجے میں حضور کو مکہ سے خفیہ طور پر ہجرت کرنی پڑی[۹۴]۔ ہجرت کے وقت آپ کے ایک صحابی (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ کفار آپ کے تعاقب میں تھے۔ حضور اپنے ساتھی سمیت ایک غار میں چھپے ہوئے تھے۔ دشمنانِ اسلام اسی غار کے بالکل قریب پہنچ گئے، یہاں تک کہ غار کے اندر بھی ان کی آہٹ برابر سنائی دے رہی تھی۔ اس نازک موقع پر آپ کے ساتھی کچھ گھبرا گئے۔ آپ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا،

"غم نہ کیجئے! اللہ ہمارے ساتھ ہے[۹۵]۔"

اللہ کی تائید و نصرت سے آپ بخیریت یثرب (مدینہ) تشریف لے گئے[۹۶] اور وہاں جاتے ہی آپ نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی[۹۷]۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے مکہ سے آنے والے مہاجرین اور مدینے کے نیک دل انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا[۹۸]۔ مدینہ میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ منافقین کا گروہ بھی آپ کا سخت مخالف تھا[۹۹]۔ سب نے مل کر حق کو نیچا دکھانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ان سب کی پھونکوں سے چراغ حق بجھنے کے بجائے تابندہ تر اور پائندہ تر ہوتا چلا گیا اور اہلِ حق ایک منظم قوت کی شکل میں ابھرتے چلے گئے[۱۰۰]۔ مکہ میں مسلمان نہایت کمزور اور بے سر و سامان تھے، دشمنوں کے نرغے میں تھے۔ مدینے میں

---

[۹۲] بنی اسرائیل ۱۔ [۹۳] الانفال ۳۰۔ [۹۴] بنی اسرائیل ۵۰، التوبہ ۱۳، ۴۰۔ [۹۵] التوبہ ۴۰
[۹۶] بنی اسرائیل ۵۰، التوبہ ۱۰۱۔ [۹۷] التوبہ ۱۰۸۔ [۹۸] آل عمران ۱۰۳، الانفال ۷۲، ۷۴
[۹۹] التوبہ ۱۰۱، ۶۴، الاحزاب ۱۲، الانفال ۴۹، المنافقون ۸۔ [۱۰۰] التوبہ ۳۲-۳۳، ۱۰۰، الصف ۸-۹، الفتح ۲۹۔

آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی تائید و نصرت سے تمکن عطا کیا، طاقتور بنایا اور خوشحال کر دیا[101]

غزوات | حضورؐ نے بہت سی لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔ جن میں غزوہ بدر[102]، غزوہ احزاب[103]، بیعت رضوان[104] (صلح حدیبیہ)، فتح مکہ[105] اور غزوہ حنین[106] شامل ہیں۔

ازواج و اولاد | آپؐ کی کئی بیویاں تھیں[107] اور اولاد بھی تھی، جن میں بیٹیاں بھی تھیں[108]۔ مگر آپؐ کا کوئی بیٹا بڑی عمر کو نہیں پہنچا[109]

وفات | آخری عمر میں آپ نے حج کیا اور خطبۂ حج بھی ارشاد فرمایا[110]۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپؐ نے انتقال فرمایا[111]

مقام و شخصیت | آپؐ انسان تھے[112]، فرشتہ نہیں تھے[113] آپؐ اللہ کے بندے[114]، اس کے رسول[115] اور آخری نبی تھے[116]۔ آپؐ معصوم تھے[117] بشریت کا کامل نمونہ تھے[118] آپؐ میں اُلوہیت کا شائبہ نہ تھا[119] آپؐ اپنی عبادات کرانے کے لئے تشریف نہیں لائے تھے[120]۔ بلکہ آپؐ نے لوگوں کو یہی دعوت دی کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کریں[121]

---

[101] الانفال ۲۶ [102] آلِ عمران ۱۲۳ [103] الاحزاب ۹ تا ۲۵ [104] الفتح ۱۸ [105] الحدید ۱۰، النصر ۱۔ [106] التوبہ ۲۵ تا ۲۷۔ [107] الاحزاب ۶، ۲۸، ۵۳، ۵۹، التحریم ۱ تا ۵۔ [108] الاحزاب ۵۹، الرعد ۳۸۔ [109] الاحزاب ۴۰ [110] التوبہ ۳ [111] الزمر ۳۰، آل عمران ۱۴۴، الحجر ۹۹، [112] التوبہ ۱۲۸، الکہف ۱۱۰، الفرقان ۷، بنی اسرائیل ۹۳،۱۰، الانبیاء ۷، ۸۔ [113] الانعام ۵۰ [114] الحدید ۹، الجن ۱۹، بنی اسرائیل ۱، الکہف ۱، النجم ۱۰ [115] آل عمران ۱۶۴، المائدہ ۶۷، الاحزاب ۲۱، ۴۰، الفتح ۲۹، الحشر ۷۔ [116] الانفال ۶۴، ۶۵، ۷۰، التوبہ ۷۳، الاحزاب ۲۸، ۴۵، ۵۰، الممتحنہ ۱۲، التحریم ۱۔ [117] الفتح ۲ [118] القلم ۴، الاحزاب ۲۱۔ [119] یونس ۴۹، ۱۵، الانعام ۱۷، ۵۰، ۵۷، ۵۸، الاعراف ۱۸۸، الرعد ۴۰، الزمر ۴۱ [120] آل عمران ۷۹۔ [121] الانبیاء ۲۵، الانعام ۱۰۲، یونس ۳، النجم ۶۲، النساء ۳۶

دوسرے انبیاء کرام کی طرح آپؐ مکلّف تھے اور قیامت کے روز اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہوں گے۔[۱۲۲]

آئینی اور قانونی حیثیت

تمام انسانوں کے لئے آپؐ واجب الاطاعت رہنما ہیں۔[۱۲۳] آپؐ کا دیا ہوا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے جس کی خلاف ورزی قابل مؤاخذہ جرم ہے۔[۱۲۴] آپؐ کی اطاعت میں لوگوں کے لئے امتحان اور آزمائش ہے۔[۱۲۵] آپؐ کی نافرمانی کا ارتکاب کرنے والا قیامت کے دن کفِ افسوس ملے گا۔[۱۲۶] آپؐ میرے مستند شارح اور شارع ہیں۔[۱۲۷] قانون سازی میں آپؐ کی سنت میری طرح مأخذِ قانون ہے۔[۱۲۸] آپؐ کا فیصلہ قیامت تک بدلا نہیں جا سکتا۔[۱۲۹] آپؐ کے حکم سے سرتابی کرنا کفر اور منافقت کی علامت ہے۔[۱۳۰] آپؐ کی پیروی ایمان کا اصلی معیار ہے۔[۱۳۱] [۱۳۲]

اخلاق و عادات

آپؐ کے اخلاق و خصائل نہایت ہی اعلیٰ تھے۔ آپؐ صادق اور امین[۱۳۳] تھے۔ بے خوف[۱۳۴]، صاحبِ عزم[۱۳۵]، ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنے والے[۱۳۶] تھے۔ بلند حوصلہ اور عالی ظرف تھے۔ اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی دعائے خیر کہنے والے[۱۳۷] تھے۔ نہایت

---

۱۲۲ البقرۃ ۱۴۵، النساء ۸۴، المائدہ ۶۷، ۱۱۶ تا ۱۱۸، الاعراف ۶۔ ۱۲۳ النساء ۶۴، ۶۵
۱۲۴ الاحزاب ۳۶۔ ۱۲۵ البقرہ ۱۴۳۔ ۱۲۶ الفرقان ۲۷۔ ۱۲۷ النحل ۴۴، ۶۴، آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲، البقرہ ۱۵۱۔ ۱۲۸ النساء ۶۵، ۱۰۵، النحل ۴۴، ۶۴، الاحزاب ۲۱، ۳۱۔
۱۲۹ الاحزاب ۴۰، الحشر، الاعراف ۱۵۷۔ ۱۳۰ النساء ۶۱۔ ۱۳۱ النساء ۶۵ ۱۳۲
القلم ۴۔ ۱۳۳ الاحزاب ۲۲، یٰسٓ ۵۲، آل عمران ۱۶۱۔ ۱۳۴ التوبہ ۴۰ ۱۳۵ الاحقاف ۳۵
۱۳۶ آل عمران ۱۵۹، النساء ۸۱، الفرقان ۵۸، التوبہ ۱۲۹، الاحزاب ۳، ۴۸۔ ۱۳۷
الاحقاف ۳۵، الاعراف ۱۹۹، المائدہ ۱۳، الحجر ۸۵، الزخرف ۸۹ ۱۳۸ التوبہ ۸۰، المنافقون ۶۔

نرم مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ تُنک مزاج اور سنگ دل نہیں[۱۳۹] تھے۔ لوگوں تک ہدایت الٰہی پہنچانے کی شدید تڑپ رکھتے تھے اور دعوتِ حق کے منکروں کی گمراہانہ روش اور سرکشی پر کُڑھتے[۱۴۰] تھے۔ آپؐ نہایت عابد و زاہد تھے۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کی یاد اور اُس کی عبادت میں مشغول رہتے[۱۴۱] تھے۔ آپؐ سادگی پسند تھے اور تکلف نہیں برتتے[۱۴۲] تھے۔ غریب اور نادار لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور ان کی دلجوئی فرماتے[۱۴۳] تھے۔ اپنی اُمت کے افراد سے حد درجہ محبت کرنے والے، ہر حال میں ان کی بھلائی چاہنے والے، ان کے نقصان سمجھنے والے اور اُن کا غم کھانے والے تھے۔ آپؐ حد درجہ مشفق اور ہمدرد[۱۴۴] تھے۔ غرضیکہ اخلاق و عادات کے معاملے میں آپؐ کی شخصیت میری تعلیمات کا اعلیٰ ترین عملی نمونہ تھی[۱۴۵]۔ آپؐ نوعِ انسانی کے لئے بہترین اخلاق کا بلند ترین معیار ہیں[۱۴۶]۔

فضائل

آپؐ کامل ترین اور بے مثال انسان تھے[۱۴۷]۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا[۱۴۸]۔ آپؐ خلقِ عظیم کے مالک[۱۴۹] تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہمیشہ کے لئے شہرۂ آفاق بنا دیا[۱۵۰]۔ آپ کو کوثر (خیرِ کثیر) عطا کیا گیا[۱۵۱]۔ آپؐ اُمّی[۱۵۲] تھے۔ مگر آپؐ کو اللہ نے کتاب و حکمت اور وسیع علم[۱۵۳] سے نوازا۔ آپؐ پر اللہ کا خاص فضل و کرم[۱۵۴] تھا۔ آپؐ سے دینِ اسلام کی تکمیل[۱۵۵] ہوئی۔ آپؐ ہدایت کے سورج اور چاند ہیں[۱۵۶]۔ تمام انبیاء کرام سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ اگر اُن کے زمانے میں آپؐ تشریف لے آئیں تو وہ آپؐ پر ایمان لائیں اور آپ

---

۱۳۹ آلِ عمران ۱۵۹۔ ۱۴۰ الکہف ۶، الشعراء ۳، النحل ۷۰، الانعام ۳۳، ۱۴۱ ہود ۱۲۳، الشعراء ۲۱۷ تا ۲۱۹، المزمل ۲۰۔ ۱۴۲ ص ۸۶۔ ۱۴۳ الانعام ۵۲، الشعراء ۲۱۵، ۱۴۴ التوبہ ۱۲۸۔ ۱۴۵ القلم ۴، الاحزاب ۲۱، ۱۴۶ الاحزاب ۲۱، القلم ۴، ۱۴۷ الاحزاب ۲۱، القلم ۴۔ ۱۴۸ الانبیاء ۱۰۷۔ ۱۴۹ القلم ۴۔ ۱۵۰ الشرح ۴۔ ۱۵۱ الکوثر۔ ۱۵۲ الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸، الجمعہ ۲۔ ۱۵۳ النساء ۱۱۳، ۱۵۴ النساء ۱۱۳، ۱۵۵ المائدہ ۳، ۱۵۶ الاحزاب ۴۶

کی تائید و حمایت کریں[157] - دوسرے انبیاء کرام کی طرح آپؐ نے کارِ نبوّت کے لئے کسی سے کوئی معاوضہ طلب[158] نہ کیا - مؤمنین کے لئے آپؐ کی بعثت اللہ کا عظیم احسان[159] ہے - آپ نہایت درجہ ذہین اور سمجھ دار[160] تھے - آپؐ پر اللہ تعالےٰ اپنی خاص رحمت بھیجتا ہے ، اُس کے فرشتے آپؐ پر درود بھیجتے ہیں اور سب مسلمانوں کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ بھی آپؐ پر درود و سلام بھیجا کریں[161] - آپؐ سے بیعت اللہ سے بیعت تھی - آپؐ کا ہاتھ اللہ کے ہاتھ کا نمائندہ[162] تھا - آپؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت[163] ہے - آپؐ کی پیروی محبتِ الٰہی کا اصل معیار[164] ہے - آپؐ کا طریقِ زندگی تمام انسانوں کے لئے اُسوۂ حسنہ[165] ہے -

زلّات حضورؐ سے چند لغزشیں بھی ہوئیں ، جن کو اللہ تعالےٰ نے فوراً معاف کر دیا[166]

آداب آپؐ کے چند مخصوص آداب ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ہر مُسلمان کے لئے لازم ہے[167]

۱ - آپؐ کی تعظیم اور احترام کرنا[168] -
۲ - آپؐ کی کامل اور غیر مشروط اطاعت کرنا[168] -
۳ - آپؐ کو اپنی جان ، مال ، اپنے بیوی بچوں ، اپنے رشتہ داروں اور دُنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب رکھنا[169] -
۴ - آپؐ کی ازواجِ مُطہّرات کو اپنی مائیں سمجھنا[170] -

---

[157] آلِ عمران ۸۱ - [158] الانعام ۹۰ ، یوسف ۱۰۴ ، الفرقان ۵۷ ، سبا ۴۷ ، صٓ ۸۶
[159] آلِ عمران ۱۶۴ [160] البقرہ ۲۴۳ [161] الاحزاب ۵۶ [162] الفتح ۱۰ ، الانفال ۱۷
[163] النساء ۸۰ [164] آلِ عمران ۳۱ [165] الاحزاب ۲۱ [166] التوبہ
الانفال ۶۷ ، التحریم ، الاحزاب ۳۷ ، عبس ۱ تا ۱۰ - [167] آلِ عمران ۱۳۲ ،
الانفال ۲۰ ، محمد ۳۳ ، الاعراف ۱۵۷ ، الحشر ۷ - [168] الفتح ۹ ، الاعراف ۱۵۷
[169] الاحزاب ۶ ، التوبہ ۹ [170] الاحزاب ۶ -

۵ - آپؐ کا نام آئے تو آپؐ پر درود و سلام بھیجنا[۱۷۱]

۶ - آپؐ کی مجلس میں مسلمانوں کو نرمی سے بات کرنے کی اجازت تھی مگر زور شور سے بولنا ممنوع تھا۔ کیونکہ اس سے اُن کے تمام اعمال ضائع ہونے کا اندیشہ تھا[۱۷۲]

۷ - آپؐ کو تکلیف اور اذیت دینا ناجائز تھا[۱۷۳]

۸ - آپؐ سے بے مقصد سوالات پُوچھنا منع تھا[۱۷۴]

۹ - آپؐ کے گھر میں داخلے اور دعوتِ طعام وغیرہ کے خاص آداب تھے جن کی پابندی ضروری تھی[۱۷۵]

۱۰ - آپؐ کو گھر سے بُلانے کے لئے چلّا کر آواز دینا ناجائز تھا[۱۷۶]

۱۱ - آپؐ کی مجلس میں اگر کوئی اجتماعی معاملہ زیرِ غور ہوتا تو آپؐ سے اجازت لئے بغیر اُٹھ کر جانا جائز نہ تھا۔[۱۷۷]

عالمگیریت

آپ کا پیغمبرانہ کام کسی خاص نسل یا قوم یا زمانے تک کے لئے محدود نہیں ہے بلکہ پوری نوعِ انسانی کے ہر دور کے لئے آپؐ کی نبوّت اور ہدایت[۱۷۸] عام ہے اس لئے آپؐ کی بعثت سے لے کر قیامت تک ہر شخص کے لئے آپؐ کی اطاعت کرنا فرض اور لازمی ہے[۱۷۹] آپؐ کو اللہ تعالےٰ نے سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا[۱۸۰] ہے۔ ہدایت کے باب میں آپ بمنزلہ آفتاب و ماہتاب ہیں جن کی روشنی پورے عالم کے لئے ہے[۱۸۱]۔ پوری نوعِ انسانی آپؐ کی مخاطب[۱۸۲] ہے۔ آپؐ پر ایمان لانا شرطِ نجات[۱۸۳] ہے۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ پوری انسانیت کے لئے مثالی نمونہ ہے[۱۸۴]۔

☆☆☆☆

---

[۱۷۱] الاحزاب ۵۶ - [۱۷۲] الحجرات ۲، ۳ - [۱۷۳] الاحزاب ۵۷، التوبہ ۶۱ - [۱۷۴] البقرہ ۱۰۸ - [۱۷۵] الاحزاب ۵۳ - [۱۷۶] الحجرات ۴، ۵ - [۱۷۷] النور ۶۲ - [۱۷۸] الاعراف ۱۵۸، سبا ۲۸، الانعام ۱۹، الاحزاب ۴۰، التکویر ۲۷، ۲۸ - [۱۷۹] آلِ عمران ۱۳۲، الانفال ۲۰، الاحزاب ۳۳، الاعراف ۱۵۸، الحشر ۷ - [۱۸۰] الانبیاء ۱۰۷ - [۱۸۱] الاحزاب ۴۶ - [۱۸۲] یوسف ۱۰۴، الفرقان ۱، الاعراف ۱۵۸، الحجر ۹، التکویر ۲۷ - [۱۸۳] الاحزاب ۲۱ -

قرآنی علوم و فہم
کا
درجہ حکمت (قسط ۱۲)

مولانا محمد تقی امینی

سماج کی آسمانی مدد و رہنمائی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک طبعی قوتیں و صلاحیتیں خام حالت میں تھیں اور بتدریج ان کو ترقی دینے اور ان میں مضبوطی و پختگی پیدا کرنے کا مرحلہ درپیش تھا جس میں ترقی، مضبوطی و پختگی اس حد تک مطلوب تھی کہ قوتوں اور صلاحیتوں میں خود نگہی و خود اعتمادی کا ایک ایسا درجہ نمودار ہو جائے کہ قدم قدم پر آسمانی مدد و رہنمائی کی ضرورت نہ محسوس ہو جیسا کہ عام زندگی میں اس درجہ سے پہلے مدد و رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ختم نبوت سے پہلے کی قوموں کے واقعات و حالات سے ثابت ہے کہ ان میں خود نگہی و خود اعتمادی اس درجہ کی نہ پیدا ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ ہر اہم کام کے وقت آسمان پر ان کی نظر رہتی اور بطور خود کسی فیصلہ تک پہنچنے میں غیر معمولی جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اس مرحلہ میں اگر یہ سلسلہ جاری نہ رہتا تو موجودہ خام حالت کو استقرار و جماؤ حاصل ہو جاتا اور وہ درجہ نہ نمودار ہوتا جو مطلوبہ سرفرازیوں کے لئے درکار تھا چنانچہ اس مرحلہ کی مدد و رہنمائی میں ایک طرف مختلف امتوں اور قوموں کی ذہنی استعداد کے لحاظ سے تفاوت تھا جس کو شریعت (دستور العمل)، و منہاج (طور طریقہ) کا اختلاف کہا جاتا ہے (نہ کہ دین کا اختلاف) اور دوسری طرف قوتوں اور صلاحیتوں کی تدریجی ترقی اور سماجی ضرورتوں میں تدریجی اضافہ کے لحاظ سے اس (شریعت و منہاج) کے اجزا میں بھی ارتقاء و اضافہ ہوتا رہا اور پہلے سے بہتر شکل دینے کی کوشش جاری رہی کہ اس کے بغیر حسب استعداد ہونے کی کوئی شکل نہ تھی۔

قرآن حکیم میں ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا [1]

تم میں ہر ایک کے لئے ہم نے شریعت (دستور العمل) اور منہاج (طور طریقہ) مقرر کیا۔

آیت نسخ سے بھی تدریجی ارتقاء و اضافہ کا ثبوت ملتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا [2]

ہم جو کچھ بدل دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم لاتے ہیں۔

نسخ (ردوبدل) میں پچھلی تعلیم موجود تھی اور نسیان میں پچھلی تعلیم فراموش یا نظر انداز ہو گئی تھی لیکن دونوں صورتوں میں ہر نئی تعلیم پچھلی سے بہتر یا اس کے مثل تھی کمتر نہ تھی کیونکہ تدریج ترقی مضبوطی اور پختگی کی طرف لے جانے کے لئے اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اوپر کی آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا الخ کے بعد ہے

وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْمَآ اٰتٰىكُمْ الخ [3]

لیکن اللہ تعالیٰ اس میں آزمائش کرتا ہے جو اس نے تم کو دیا۔

مولانا حمید الدین فراہی نے اس سے یہ استدلال کیا ہے۔

فلا يبتلى الله الامة الا فيما اتاهم فلذلك جعل شرائع كل امة حسب حالها ومن هذه الجهة اختلافهم وجاء الكمل الشرائع لاكمل الامم [4]

اللہ تعالیٰ انہیں قوتوں اور صلاحیتوں میں آزمائش کرتا ہے جو اس نے لوگوں کو دیا ہے اسی وجہ سے امت کی شریعتیں ان کے حسب حال مقرر کی گئیں اور کامل شریعتیں (پہلے کے لحاظ سے) کامل (پہلی کے مقابلہ میں) اُمتوں کے لئے آئی ہیں۔

---

[1] المائدہ آیت ۴۸ [2] البقرۃ آیت ۱۰۶ [3] المائدہ آیت ۴۸

[4] حمید الدین فراہی القاید الی عیون العقائد النبی وامتہ والمماثلۃ بینہما

دوسری جگہ ہے۔

من اُصول التشریع التدریج وھذا حسب الاستعداد وکما تری فی الخلقۃ وفی ترقیۃ العلوم والصنائع والاخلاق فلابد من النسخ علی طریق الزیادۃ واما النسخ بالبدل ففیہ ایضا زیادۃ من جھۃ الحکمۃ[1]	شریعت سازی کے اصول میں تدریج ہے اور یہ استعداد کے لحاظ سے ہے جیسا کہ تم پیدائش، علم، صنعت اور اخلاق کی ترقی میں تدریج دیکھتے ہو اس بنا پر نسخ (رد و بدل) ضروری ہے یہ نسخ اضافہ کر کے ہوتا ہے۔ لیکن بدل اور مثل کے ساتھ جو ہوتا ہے اس میں بھی حکمت کی جہت سے اضافہ ہوتا ہے۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آسمان سے صرف مدد و رہنمائی آتی ہے سماج نہیں آتا ہے وہ اس دنیا میں انسان کے ہاتھوں وجود میں آتا اور ترقی پاتا ہے جس میں خیر کے ساتھ شر حسن کے ساتھ قبح اور خوبی کے ساتھ خامی کا ظہور ہوتا ہے پھر سماج کی قوت محرکہ (شعور، خواہش، ضرورت، تقاضے اور مطالبے) میں جس قسم کا شدید تصادم ہوتا اور نتیجہ میں جس قسم کا تضاد رونما ہوتا ہے اس سے سماج کے کسی مرحلہ میں بھی محض خیر، حسن اور خوبی کی توقع رکھنا فضول ہے اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ ان سب (خیر، حسن، خوبی) کو سماج میں اپنی توانائی برقرار رکھنے اور اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے اپنے مقابل (شر، قبح، خامی) کی ضرورت ہے یہ تو آسمانی مدد و رہنمائی کی کرشمہ سازی ہے کہ ایک طرف وہ طبعی قوتوں کے تزکیہ (صیقل کرنے)، تغذیہ (غذا پہنچانے)، تنمیہ (آگے بڑھانے) اور رکاوٹوں کے ازالہ کا بندوبست کرتی ہے اور دوسری طرف خیر و شر، حسن و قبح اور خوبی و خامی کی نشاندہی کر کے ان کے معیارات قائم کرتی ہے۔ پھر خیر و شر، حسن و قبح اور خوبی و خامی کے درمیان نسبت اور زندگی کے گوشوں میں عدل و اعتدال کی قوت کو ملحوظ رکھ کر مثالی سماج کا نمونہ پیش کرتی ہے اور موجودہ سماج کے ساتھ اس کا رویہ نہایت ہمدردانہ فیاضانہ اور مصالحانہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

والذی اتی بالانبیاء	وہ انبیاء علیہم السلام اللہ رب العزت
قاطبة من عند اللہ تعالیٰ	کی طرف سے جو احکام و شرائع لاتے
فی ھذا الباب الخ [1]	ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم کے پاس

معاشرت اور معاملات وغیرہ کے جو قواعد و قوانین ہوتے ہیں ان میں وہ صلاحی وانتفاعی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتے ہیں۔ کھانے پینے کے آداب، لباس، عمارت، زیب وزینت کے طور طریقے، نکاح کے دستور اور آپس میں نکاح کرنے والوں کی سیرت بیع وشراء کے قاعدے قانون اور ان کے علاوہ جرائم سے روک تھام اور معاملات کے تصفیہ وغیرہ سے متعلق اصول وضوابط جو لوگوں میں رائج ہوتے ہیں اگر وہ مجموعی طور پر شریعت کی پالیسی اور رائے کلی کے مطابق ہوتے ہیں تو یہ حضرات ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی رائے کو قوت پہنچاتے اور ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور اگر وہ کلی پالیسی کے مطابق نہیں ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں انفرادی واجتماعی ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، لذات دنیوی میں انہماک اور روحِ شریعت سے اعراض پر مبنی ہوتے ہیں یا دینی ودنیوی مصلحتوں کے فوت ہونے کا خطرہ رہتا ہے جن کی بنا پر ان مراسم واحکام میں تبدیلی یا انہیں بالکلیہ ختم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو ایسی صورت میں بھی یہ حضرات ان کے مرغوبات ومالوفات کی رعایت کرتے ہیں اور بالکلیہ انکی ضد کی طرف دعوت نہیں دیتے ہیں بلکہ ان کے مماثل ومشابہ جو چیزیں قوم میں رائج ہوتی ہیں یا ان میں صالح شخصیتوں کی طرف مشہور ومنسوب ہوتی ہیں ان کے مماثل ومشابہ کی طرف قوم کو دعوت دیتے ہیں"۔

دوسری جگہ ہے۔

فماکان صحیحا موافقا	ان احکام ومراسم میں جو باتیں صحیح
للقواعد السیاسیة الملیة	اور ملی سیاست کے اصول کے
لایغیرہ بل تدعوا الیہ	مطابق ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام
وتحث علیہ وماکان سقیما	ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے ہیں۔

---

[1] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغۃ باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم

قد دخله التحریف	بلکہ ان کی طرف دعوت دیتے اور قوم
فانها تغیره بقدر الحاجة	کو ابھارتے ہیں اور جو باتیں بری
وما کان حریًا ان	ہوتی ہیں یا احکام میں تبدیلی کردی
یزاد فانها تزید علی	جاتی ہے تو بقدر ضرورت ان میں ترمیم
ما کان عندهم [1]	کردیتے ہیں۔ اور جن میں اضافہ کی

ضرورت ہوتی ہے ان میں اضافہ کردیتے ہیں۔

اس طرح آنے والی مدد و رہنمائی مروجہ احکام و مراسم اور لوگوں کے مرغوبات و مالوفات کے قلع قمع کرنے میں شمشیر بے نیام نہیں ہوتی کہ جو بات بھی مروج دیکھی اس کو ختم کردیا یا جو لوگوں کی پسندیدہ چیز ہوتی اس سے روک دیا بلکہ عوامی شعور کی کیفیت اور سماجی برداشت کی طاقت کا اندازہ کرکے "خذ ما صفا ودع ما کدر" (جو صاف ہو اسے لے لو اور جو گدلا ہو اسے چھوڑ دو) پر عمل کرکے وہ قالب و ڈھانچہ تیار کرتی یا دستور العمل مرتب کرتی ہے جس کا نام شریعت و منہاج گذر چکا۔ قالب و ڈھانچہ کی تیاری یا دستور العمل کی ترتیب میں آسمانی مدد و رہنمائی کی نظر کن کن چیزوں پر ہوتی، اس کو کن کن گوشوں تک رسائی حاصل کرنی پڑتی اور کن کن رکاوٹوں کو دور کرنا پڑتا ہے۔ پھر تجویز و تشخیص کے ہر مرحلہ میں کن کن باتوں کی رعایت ضروری قرار پاتی ہے ان سب کو کسی درجہ میں سمجھنے کیلئے طبیب حاذق کے کام میں غور کرنے کی ضرورت ہے جس کی نظر مرض کی قوت، اس کی نوعیت، مریض کی عمر، جائے رہائش اور موسم نیز دوا، غذا، کی قوت ان کی خاصیت و اثر اور پرہیز سے متعلق باتوں پر ہوتی ہے جن کو ملحوظ رکھ کر وہ بہت سی ان باتوں کی خبر دیتا جن کو لوگ نہیں جانتے لان باریکیوں تک رسائی حاصل کرتا جن سے وہ لاعلم ہوتے ہیں، کبھی وہ محسوس کو غیر محسوس کے قائم مقام قرار دیتا مثلاً چہرہ کی سرخی کو غلبۂ خون کی علامت بتاتا، کبھی دوا کی مخصوص مقدار کو ازالۂ مرض کے قائم مقام بتاکر قاعدہ کلیہ وضع کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص فلاں دوا یا معجون کی اتنی مقدار نہ استعمال کرے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔ کبھی وہ مرض کی

---

[1] ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ باب اسباب نزول الشرائع الخاصۃ الخ

نوعیت اور مریض کی کیفیت دیکھ کر نئے مرکبات تیار کر کے ان کو مخصوص امراض کے لئے تیر بہدف ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح مرض کے ازالہ اور صحت کی بحالی کے لئے جو دوا و وغذا تجویز کرتا ہے اس میں وہ نبض کی حرکت، مریض کی حرارت مرض اور مزاج کی کیفیت، قویٰ، عمر اور موسم سب کو ملحوظ رکھتا ہے۔ پھر مریض، مرض اور موسم کے احوال میں تبدیلی کے ساتھ دوا اور غذا میں معمولی تبدیلی کرتا رہتا ہے اگر سابقہ احوال پھر واپس آجاتے ہیں تو سابقہ لکھی ہوئی دوائیں اور غذائیں دوبارہ استعمال کرانے لگتا ہے اور ان سب سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مزاج میں اعتدال کی کیفیت اور طبیعت میں مدافعت کی قوت بحال ہو کر ان سے بجائے خود ازالۂ مرض ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

انما مثله كمثل الطبيب
يعمل الى حفظ المزاج
المعتدل في جميع
الاحكام فتختلف احكامه
باختلاف الاشخاص
والزمان فيامر الشاب
بما لا يامر الشائب ويامر
في الصيف بالنوم في
الجو لما يرى ان الجو
مظنة الاعتدال حينئذ
ويامر في الشتاء بالنوم
داخل البيت لما يرى انه
مظنة السرد حينئذ[۱]

اس کی مثال طبیب جیسی ہے کہ وہ ہر حالت میں معتدل مزاج کی حفاظت ضروری سمجھتا ہے طبیب کے احکام (تشخیص و تجویز سے متعلق) زمانہ اور اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں جوان کے لئے وہ جو تجویز کرتا ہے بوڑھے کے لئے وہ نہیں کرتا۔ موسم گرما میں کھلی فضا میں سونے کے لئے کہتا ہے اور موسم سرما میں گھروں کے اندر سلاتا ہے موسم کے اس اختلاف کی بناء پر مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کی خاطر اپنی ہدایات کے اختلاف کو وہ ضروری قرار دیتا اور اسی پر اس کا عمل درآمد ہوتا ہے۔

---

[۱] ولی اللہ حجۃ اللہ البالغۃ باب اسباب نزول الشرائع الخاصۃ الخ

اوپر انسان سے متعلق مباحث میں گذر چکا ہے کہ اعلیٰ قدروں کے نقوش انسان کی ساخت میں ثبت ہیں دین کے نام سے انہیں کا نوری پیکر تیار کیا جاتا ہے جس کے اجزاء یہ ہیں ۔

(۱) ایمان و اعتقاد (۲) طہارت و پاکی ۔
(۳) عبادت و طاعت (۴) نیکی و بدی
(۵) پاکیزگی و گندگی ۔

ان اجزاء کو عملی شکل دے کر جو دستور العمل مرتب کیا جاتا یا جو قالب و ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اس کا نام شریعت و منہاج ہے ۔ ان اجزاء میں بعض حقائق کے قالب و ڈھانچے اللہ کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں اور بعض کے قالب ڈھانچے اللہ کی ہدایت سے رسول و نبی مقرر کرتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کی مناسبت سے دو لفظ لائے گئے ہوں پہلی کو شریعت اور دوسری کو منہاج کہا گیا ہو ۔

(باقی آئندہ)

بقیہ : ۔ مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت

پروے دور نہ قرضِ حسنہ کے طور پر دو اس سے اللہ راضی و خوش ہوتا اور بندہ بڑے اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی تھا کہ آپ نے ہمیشہ نہ صرف یہ کہ اپنی ضرورت سے زائد بلکہ اپنی ضرورت کا مال و متاع دوسرے ضرورت مندوں کو یونہی مفت دیا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے کسی کو مضاربت پر مال دیا اور اس سے نفع کا ایک حصہ لیا ہو ۔ لہٰذا صحابۂ کرام نے سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں عموماً یہی طرزِ عمل اختیار کیا اپنا کام خود کیا یا اپنے غلاموں سے کرایا جن کی معاشی کفالت ان کے ذمہ تھی اور ضرورت مندوں کو اپنا زائد از ضرورت مال صدقہ و ہبہ کے طور پر یا قرضِ حسنہ کے طور پر دیا اور ایسا بہت ہی کم اور کہیں خال خال ہوا کہ کسی نے اپنا مال دوسرے کو مضاربت اور نفع کے ایک حصہ پر دیا اور وہ بھی یتیموں وغیرہ کی مصلحت کی خاطر دیا نہ یہ کہ اپنی نفع اندوزی اور دولت مندی کو بڑھانے کی خاطر دیا ۔

مولانا محمد طاسین

مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت

قسط (۳)

مضاربت اور آثارِ صحابہؓ اب میں ان آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف آتا ہوں جو جوازِ مضاربت کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں، امام مالکؒ نے مؤطا میں دو آثار ذکر کئے ہیں۔ ایک حضرت عمر فاروقؓ اور ان کے دو صاحبزادوں حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ سے متعلق ہے اور دوسرا حضرت عثمانؓ غنی سے متعلق، پہلے کے الفاظ اس طرح ہیں:

عن مالك بن انس عن زيد بن اسلم عن ابيه انه قال خرج عبدالله وعبيد الله ابنا عمر بن الخطاب فى جيش الى العراق، فلما قفلا مرا على ابى موسى الاشعرى فرحب بهما وسهل وهو امير البصرة فقال لو اقدر لكما على امر انفعكما به لفعلت، ثم قال بلى هٰهنا مال من مال الله اريد ان ابعث به الى امير المؤمنين، فاسلفكماه فتبتاعان به متاعا من متاع العراق فتبيعانه بالمدينة فتؤديان رأس المال الى امير المؤمنين ويكون لكما الربح فقالا وددنا، ففعلا، فكتب الى عمر ياخذ منهما المال، فلما قدما المدينة باعا وربحا، فلما رفعا الى عمر قال أكل الجيش اسلفه كما اسلفكما؟ قالا: لا، قال عمر ابنا امير المؤمنين فاسلفكما ادّيا المال وربحه، فاما عبدالله فسكت، واما عبيد الله فقال لا ينبغى لك يا امير المؤمنين هذا، لو هلك المال او نقص لضمناه، قال ادّياه فسكت عبد الله وراجعه عبيد الله، فقال رجل من جلساء عمرؓ يا امير المؤمنين لو جعلته

قراضاً فقال قد جعلته قراضا، فاخذ عمر المال ونصف ربحه واخذ عبد الله وعبيد الله نصف ربح المال (ص ۱۸۵)

ترجمہ: امام مالک نے زید بن اسلم سے، اس نے اپنے باپ اسلم سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے عبد اللہ اور عبید اللہ ایک لشکر میں عراق گئے، واپسی پر بصرہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ملاقات ہوئی جو اس وقت بصرہ کے امیر تھے۔ انہوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور اھلاً وسھلاً کہا اور فرمایا اگر میرے بس میں کوئی ایسا کام کرنا ہوتا جس سے آپ کو نفع پہنچتا تو ضرور کرتا، پھر فرمایا ہاں یاد آیا۔ میرے پاس بیت المال کی کچھ رقم ہے جو میں امیر المؤمنین کے پاس مدینہ بھیجنا چاہتا ہوں، آپ پسند کریں تو وہ رقم میں آپ کو بطور قرض دے دوں، آپ اس کے عوض یہاں عراق سے کوئی مال خرید کر لے جائیں اور مدینہ میں فروخت کر دیں، نفع خود لے لیں اور اصل رقم امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کر دیں۔ انہوں نے جواب دیا ہاں یہ تجویز ہمیں پسند ہے۔ معاملہ ہو گیا۔ انہوں نے اس رقم سے مال خریدا اور مدینہ منورہ پہنچ کر نفع سے بیچا، جب اصل رقم پیش کرنے کے لئے اپنے والد امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری بات سنائی تو وہ ناراض ہوئے اور غصے سے پوچھا کہ امیر بصرہ نے جس طرح تمہیں قرض دیا اس طرح لشکر کے دوسرے سپاہیوں کو بھی دیا؟ انہوں نے جواب دیا، نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس لئے کہ تم امیر المؤمنین کے بیٹے تھے، میرا حکم ہے کہ اصل مال اور جو نفع ہوا ہے سب بیت المال کے حوالے کر دو۔ اس پر حضرت عبد اللہ تو خاموش رہے لیکن حضرت عبید اللہ نے عرض کیا امیر المؤمنین ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر یہ مال پورا یا اس کا کچھ حصہ تلف ہو جاتا تو ہم اس کے ضامن ہوتے۔ لہٰذا اس کا نفع ہمیں ملنا چاہیئے، پھر حضرت عمر فاروقؓ نے دوبارہ فرمایا، ان باتوں کو چھوڑو اور پورا مال بمعہ نفع ادا کرو۔ اس مرتبہ بھی حضرت عبد اللہؓ کچھ نہ بولے اور حضرت عبید اللہ نے وہی پہلے الفاظ دہرائے۔ اس وقت پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا امیر المؤمنین اس معاملے کو قراض بنا دیجئے تو آپ نے فرمایا۔ چلو میں نے قراض بنا دیا، اور اصل مال بمعہ نصف نفع کے لے لیا اور نصف نفع صاحبزادوں کے پاس رہنے دیا۔

اس اثر کے متعلق علماء کرام نے لکھا ہے کہ اس میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ کسی طرح

بھی مضاربت کا معاملہ نہیں کیونکہ اس میں صاف طور پر یہ بیان ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادوں کو جو رقم دی وہ بطور قرض تھی جبکہ مضاربت کی رقم عامل کے ہاتھ میں بطور امانت ہوتی ہے، اسی طرح اس میں تصریح ہے کہ اگر مال پورا یا اس کا کچھ حصہ ہلاک اور تلف ہو جاتا تو اس کے ضامن وہ دونوں بھائی ہوتے حالانکہ مضاربت میں مال تلف ہونے کی صورت میں کام کرنے والا فریق ضامن وذمہ دار نہیں ہوتا، اور پھر مضاربت میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ معاملے کی ابتدا ہی میں یہ متعین ہو کہ فریقین کے مابین نفع کس تناسب سے تقسیم ہوگا جبکہ اس معاملے میں سرے سے ایسی کوئی چیز نہیں۔ مثلاً شارح مؤطا علامہ زرقانی نے اس اثر کی شرح میں لکھا ہے:

کانہ جعل ذلک قطعًا للنزاع اذ لیس من القراض فی شئی۔ گویا حضرت عمرؓ نے ایسا نزاع کو ختم کرنے کے لئے کیا کیونکہ اس روائت میں جس معاملے کا ذکر ہے اس کا قراض سے کچھ تعلق نہیں۔ ص ۳۴۶ - ج ۳

علامہ ابن عبدالبر نے بھی الاستذکار شرح المؤطا میں بھی ایسی ہی بات لکھی ہے جس کو علامہ ابن ترکمانی نے الجوھر النقی میں نقل کیا ہے۔ جو السنن الکبریٰ کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔

علامہ طحاوی نے اپنی کتاب اختلاف الفقہاء میں اس روائت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے " یحتمل ان یکون عمر شاطرھما کما شاطر عمالہ اموالھم" احتمال ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں سے جو نصف منافع لیا۔ یہ ویسا ہی ہو جیسا آپ نے اپنے عمال سے ان کے مال کا نصف لے کر بیت المال میں داخل کیا، جو ان کو لوگوں نے بطور ہدیہ دیا تھا۔ مطلب یہ کہ واقعہ مذکور میں منافع کی نصف نصف تقسیم مضاربت کے طور پر نہ تھی۔

امام بیہقی نے اپنی کتاب السنن الکبریٰ میں اثر مذکور بیان کیا اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ یہ معاملہ امام المزنی کے نزدیک مضاربت کا معاملہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے حضرت عمرؓ کے اپنے بیٹوں سے نصف منافع لینے کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے باپ کی حیثیت سے اپنے بیٹوں سے یہ کہا کہ پورا منافع بیت المال کو دے دو۔ جب وہ خوشی کے ساتھ اس پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر فرمایا آدھا دے دو چنانچہ انہوں نے والد کی خوشی کے لئے آدھا دے دیا وہ عربی عبارت یہ ہے:

تأول المزنی هذہ القصة بانہ سألهما البر الواجب علیهما ان یجعلاہ کلہ للمسلمین فلم یجیباہ فلما طلب النصف اجاباہ عن طیب انفسهما (ص ۱۱۳ ـ ج ۶ ـ السنن الکبریٰ)

ترجمہ: امام مُزنی نے اس قصے کی یہ تأویل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹوں سے یہ جو فرمایا کہ پورا نفع مسلمانوں کے بیت المال میں دے دو تو آپ کا یہ فرمانا اس بر واحسان کی وجہ سے تھا جو بیٹوں پر باپ کے لئے واجب ہوتا ہے جب انہوں نے اس کو قبول نہ کیا تو پھر آپ نے نصف دینے کا فرمایا۔ اس پر وہ خوشی سے تیار ہو گئے ۔ اور بطیب خاطر دے دیا۔

امام مزنی کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادوں سے جو نصف نفع لیا اس کی حیثیت اس حق کی نہیں تھی جو مضاربت میں رب المال کے لئے واجب ہوتا ہے بلکہ اس حق کی سی تھی جو فرمانبردار بیٹوں پر باپ کے لئے ہوتا ہے۔

لہٰذا یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب روایت مذکور میں بیان شدہ معاملہ مضاربت وقراض کا معاملہ نہ تھا تو امام مالک وغیرہ نے اس کو کتاب القراض میں کیوں نقل کیا ہے!

اس کا جواب علامہ زرقانی نے شرح المؤطا میں یہ دیا ہے۔

وانّما ساق مالک هذا الحدیث اعلامًا بان القراض کان معمولاً بہ من عهد عمر، وقیل هو اول قراض فی الاسلام، وقیل اولہ ان عمر اخرج من السوق من لا یعلم البیع، وان فیهم لیعقوب مولی الحرقة فاعطاہ عثمان مالا واجلسہ فی السوق، فان کان محفوظاً فمعناہ ان عثمان کان یعلمہ ویراعی احوالہ ، ولا ینبغی ان یظن بعثمان فی فضلہ ودینہ الا ذٰلکؔ ـ ص ۳۴۶ م ۳، ج ۳ ـ

ترجمہ: امام مالک نے یہ حدیث باب القراض میں اس لئے ذکر کی ہے کہ اس کے آخری الفاظ " لو جعلتہ قراضا فقال قد جعلتہ قراضاً " اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں قراض پر عمل ہوتا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام میں قراض کا پہلا معاملہ یہی ہے جو اس روایت میں بیان ہوا ہے ، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اسلام میں قراض کا پہلا معاملہ وہ ہے جو حضرت عمرؓ کے

عہدِ خلافت میں حضرت عثمان اور یعقوب مولی الحرقہ کے درمیان وقوع پذیر ہوا، وہ اس طرح کہ حضرت عمر کے حکم سے ایسے لوگوں کو بازار سے نکال دیا گیا جو بیع و شراء کے شرعی احکام نہیں جانتے تھے، ان میں ایک یعقوب مولی الحرقہ بھی تھا پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے مال دیا اور بازار میں بٹھایا، پس اگر یہ بات محفوظ اور صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ کہ حضرت عثمان اسے بیع سے متعلق شرعی احکام کی تعلیم دیتے اور اس کے احوال کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے فضل و ورع اور ان کی سخاوت کے وغیرہ کے پیشِ نظر بھی مطلب لینا چاہیئے کیونکہ یہی ان کے شایانِ شان ہے۔ یہ گمان کرنا مناسب نہیں کہ آپ اس سے نفع کا ایک حصّہ لیتے تھے۔

علّامہ زرقانی کی اس عبارت میں کئی چیزیں قابلِ غور اور لائقِ توجّہ ہیں، اس میں لفظ قِیْلَ سے جو دو قول نقل کئے گئے ہیں اس کے نزدیک کمزور اور ضعیف سہی لیکن بہر حال علماء ہی کے قول ہیں جس نے جو بات کہی ہے ضرور کسی دلیل ہی کی بنیاد پر کہی ہوگی، اگر علّامہ زرقانی یہ بھی بیان فرما دیتے کہ مذکورہ دو قول کن حضرات کے اور کن دلائل کی بناء پر ہیں تو حقیقتِ حال کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی لیکن چونکہ ان کے نزدیک نہ وہ معاملہ مضاربت و قراض کا معاملہ ہے جو حضرت عمر فاروق اور ان کے صاحبزادوں کے درمیان وقوع پذیر ہوا اور نہ وہ معاملہ قراض و مضاربت کا معاملہ ہے جو حضرت عثمانؓ غنی اور یعقوب مولی الحرقہ کے مابین ظہور پذیر ہوا۔ لہٰذا وہ اس بحث میں ہی نہیں پڑے کہ ان میں سے کونسا معاملہ، اسلام میں قراض و مضاربت کا پہلا معاملہ ہے۔

عبارت مذکور کے بعد علّامہ زرقانی نے ابو عبد الملک کا یہ قول نقل کیا ہے:

ولا اصل للقراض فی کتاب اللہ ولا سنۃ الّا انہ کان فی الجاھلیۃ فاقرفی الاسلام واجمع علی جوازہ بالدنانیر والدراھم قالہ ابو عبد الملک۔ ص ۳۴۶۔ ج ۳۔

ترجمہ: اور کوئی اصل اور دلیل قراض و مضاربت کے لئے نہ کتاب اللہ میں موجود ہے اور نہ سنّتِ رسول میں۔ اگر کوئی دلیل ہے تو صرف یہ کہ یہ معاملہ دورِ جاہلیّت میں رائج تھا اور اسلام میں اس کو برقرار رکھا گیا اور دراہم و دنانیر کے ساتھ اس کے جواز پر اتفاق و اجماع ہو گیا۔

علامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی کا ابوعبدالملک کے اس قول کو نقل کرکے اس پر خاموش رہنا اور اس کے خلاف کچھ نہ لکھنا، اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ قول صحیح ہے یعنی یہ کہ کتاب وسنّت میں قراض ومضاربت کے متعلق کوئی دلیل نہیں، نیز ان کی تشریح سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روائت مذکور میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ قراض ومضاربت کا معاملہ نہیں لہٰذا اس معاملے کی وجہ سے یہ روائت جوازِ قراض کی دلیل نہیں بن سکتی اور اس کو مضاربت کے ثبوت میں پیش کرنا درست نہیں۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں قراض سے متعلق جو دوسرا اثر بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

مالكؒ عن العلاء بن عبدالرحمٰن عن ابيه عن جده ان عثمان بن عفان اعطاه مالا قراضا يعمل فيه على ان الربح بينهما۔

ترجمہ: امام مالکؒ نے علاءؒ بن عبدالرحمٰن سے، اس نے اپنے باپ عبدالرحمٰن سے اس نے علاء کے دادا یعنی عبدالرحمٰن کے باپ یعقوب مولیٰ الحرقہ سے روائت کیا کہ اس کو یعنی یعقوب مولیٰ الحرقہ کو حضرت عثمان بن عفان نے قراض پر مال دیا کہ تم اس میں کام کرو۔ اور نفع ہم دونوں میں تقسیم ہوگا۔

یہی روائت السنن الکبریٰ میں امام بیہقی نے ان الفاظ سے بیان کی ہے:۔

عن يعقوب انه قال: جئت عثمان بن عفان فقلت له قد قدمت سلعة فهل لكؒ ان تعطيني مالا اشترى بذلكؒ فقال أتراك فاعلا! قلت نعم ولكني رجل مكاتب فاشتريها على ان الربح بيني وبينكؒ قال نعم، فاعطاني مالا على ذلك ص ١١١، ج ٦۔

یعقوب مولیٰ الحرقہ نے روائت کرتے ہوئے کہا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ باہر سے کوئی تجارتی مال وسامان آیا ہے، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے مال دیں اور میں وہ سامان خرید لوں، آپ نے فرمایا کیا تم اس کیلئے آمادہ ہو۔ میں نے کہا ہاں لیکن میں ایک مکاتب شخص ہوں مجھے بھی بدل کتابت ادا کرنے کے لئے مال کی ضرورت ہے۔ میں اس سامان کو خریدتا ہوں اس شرط پر کہ نفع میرے اور آپ کے مابین تقسیم ہو، فرمایا ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ نے مجھے اس معاہدے پر مال دیا۔

پھر یہی روایت امام محمد الشیبانی نے اپنے مؤطا میں" باب، الشرکۃ فی البیع" کے تحت قدرے تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان فرمائی ہے:۔

اخبرنا مالکؒ، اخبرنا العلاء بن عبد الرحمٰن بن یعقوب ان اباہ اخبرہ قال اخبرنی ابی قال کنت ابیع البز فی زمان عمرؓ بن الخطاب، و ان عمر قال لا یبیعہ فی سوقنا اعجمی فانھم لم یفقھوا فی الدین ولم یقیموا فی المیزان والمکیال قال یعقوب فذھبت الی عثمان بن عفانؓ فقلت لہ ھل لک فی غنیمۃ باردۃ؟ قال ما ھی؟ قلت بزّ قد علمت مکانہ یبیعہ صاحبہ برخص لا یستطیع بیعہ، اشتریہ لک ثم ابیعہ لک قال نعم، فذھبت وصفقت بالبز، ثم جئت بہ فطرحت فی دار عثمانؓ، فلما رجع عثمانؓ فرأی الحکوم فی دارہ، قال ما ھذا؟ قالوا بز جاء بہ یعقوب، قال ادعوہ لی، فجئت فقال ما ھذا! قلت ھذا الذی قلت لک، قال نظرتہ؟ قلت کفیتک ولکن رابہ حرس عمرؓ قال نعم فذھب عثمانؓ الی حرس عمرؓ فقال ان یعقوب یبیع بزّی فلا تمنعوہ قالوا نعم فجئت بالبز السوق فلم البث حتی جعلت ثمنہ فی مزود، وذھبت الی عثمان وبالذی اشتریت البز منہ فقلت عدّ الذی لک فاعتدّہ و بقی مال کثیر، قال قلت لعثمان ھذا لک امالی لم اطلع بہ احدا، قال جزاک اللہ خیرا وفرح بذلک، قال فقلت آمالی قد علمت مکان بیعھا مثلھا او افضل، قال وعائد انت؟ قال قلت نعم ان شئت قال قد شئت قال فقلت فانی باغ خیرا فاشرکنی قال نعم بینی وبینک۔ ص ۳۴۷ ـ ۳۴۸ المؤطا للامام محمد

ترجمہ: ہم سے امام مالک نے، ان سے علاء نے، ان سے ان کے باپ عبد الرحمٰن نے اور ان سے ان کے باپ یعقوب نے بیان کیا کہ میں عہدِ فاروقی میں کپڑے بیچا کرتا تھا کہ حضرت عمرؓ نے یہ فرمان جاری کیا کہ ہمارے بازار میں کوئی عجمی دکانداری نہ کرے کیونکہ وہ دین کی سمجھ نہیں رکھتے اور ناپ تول میں گڑبڑ کرتے ہیں، لہٰذا عجمی ہونے

کی وجہ سے مجھے بھی بازار سے نکال دیا گیا، میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کیا آپ کو سفت کا فائدہ منظور ہے؟ انہوں نے فرمایا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کپڑا ہے جس کی جگہ مجھے معلوم ہے۔ اس کا مالک اس کو سستا بیچنا چاہتا ہے کیونکہ عجمی ہونے کی وجہ سے وہ اسے بازار میں نہیں بیچ سکتا۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کو آپ کے لئے خرید لوں اور آپ ہی کے لئے فروخت کر دوں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے، چنانچہ میں اس شخص کے پاس گیا اور کپڑا ادھار پر خرید لیا۔ اور لاکر حضرت عثمان کے گھر میں ڈال دیا۔ حضرت عثمان جب باہر سے گھر تشریف لائے تو کپڑے کی گٹھڑیاں گھر میں دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہے؟ گھر والوں نے بتلایا کپڑا ہے جسے یعقوب لایا ہے۔ فرمایا اسے میرے پاس بلاؤ، وہ آیا تو آپ نے پوچھا یہ کیسا کپڑا ہے؛ میں نے کہا وہی جس کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ فرمایا کہ تم نے اس کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کچھ فکر نہ فرمائیے۔ میں نے آپ کی طرف سے سب کچھ کر لیا ہے، البتہ اس کو بیچنے کی راہ میں جو رکاوٹ ہے وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کے چوکیدار مجھے یہ بازار میں بیچنے نہیں دیتے اسلئے کہ میں عجمی ہوں۔ آپ ان سے فرما دیں تو نہیں روکیں گے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ چوکیداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ یعقوب میرے کپڑے بیچتا اور میرا آدمی ہے اس کو بازار میں بیٹھنے سے نہ روکیں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا، پھر میں کپڑا لے کر بازار میں گیا اور زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ سب فروخت ہو گیا، میں نے رقم تھیلی میں ڈالی اور اس شخص کو ساتھ لے کر جس سے کپڑا ادھار لیا تھا حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا۔ پہلے اس شخص سے کہا کہ اس رقم میں اتنی رقم اپنے لئے گن لو جو طے ہوئی ہے۔ اس نے گن کر لے لی اور کافی رقم تھیلی میں باقی رہ گئی۔ میں نے حضرت عثمان سے عرض کیا کہ یہ رقم آپ کی ہے۔ اور آپ آگاہ رہیں کہ میں نے کسی سے یہ ناحق اور ظلم کے طور پر نہیں لی، انہوں نے آگے سے فرمایا جزاک اللہ خیراً اور خوشی کا اظہار کیا، پھر میں نے عرض کیا آپ آگاہ رہیں کہ ایسی ہی بلکہ اس سے بہتر ایک اور جگہ بھی میرے علم میں ہے جہاں سے مال خرید کر کافی نفع کمایا جا سکتا ہے۔ تو اس پر حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کیا تم دوبارہ کام کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ہاں اگر آپ چاہیں تو، جواب دیا منظور ہے۔ پھر میں نے عرض کیا

کہ میں بھلائی چاہتے اور نفع کمانے والا آدمی ہوں آپ مجھے اپنے ساتھ نفع میں شریک کر لیجئے۔ آپ نے فرمایا اچھا، نفع میرے اور آپ کے درمیان تقسیم ہوگا۔

اس روایت سے متعلق جو بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ امام محمد شیبانی نے اسے قراض و مضاربت کے عنوان کے تحت نہیں بلکہ شرکۃ فی البیع کے زیرِ عنوان بیان کیا ہے جس کا مطلب یہ کہ امام محمد کے نزدیک وہ معاملہ جو حضرت عثمان غنی اور حضرت یعقوب مولیٰ الحرقہ کے مابین طے پایا قراض و مضاربت کا معاملہ نہ تھا بلکہ شرکت کا معاملہ تھا، اسی طرح اعلاء السنن جلد ۱۳ میں بھی اس روایت اور اثر کو شرکت کے باب میں بیان کیا گیا ہے مضاربت و قراض کے باب میں بیان نہیں کیا گیا گویا کہ اس کا تعلق شرکت سے ہے مضاربت سے نہیں۔

قراض و مضاربت کے باب میں ایک اثر حضرت حکیم بن حزام کا بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جو سنن الدارقطنی اور سنن الکبریٰ للبیہقی میں ہے۔ امام بیہقی نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

عن حکیم بن حزام انہ کان یدفع المال مقارضۃً الی الرجل و یشترط علیہ ان لا یمربہ بطن واد، ولا یبتاع بہ حیوانا ولا یحملہ فی بحر فان فعل شیئا من ذٰلک فقد ضمن ذٰلک المال قال فاذا تعدیٰ امرہ ضمنہ من فعل ذٰلک۔

ص ۱۱۱ - ج ۶ - السنن الکبریٰ

ترجمہ : حضرت حکیم بن حزام جب کسی شخص کو مضاربت پر مال دیتے تو یہ شرط لگاتے کہ وہ کسی ایسی نشیبی وادی میں سے بھی نہیں گزرے گا جس میں سیلاب آنے کا اندیشہ ہو۔ اور کوئی جانور بھی نہیں خریدے گا اور دریا کا سفر بھی نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اس مال کا ضامن ہوگا، چنانچہ جب کوئی اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتا تو وہ نقصان کا ضامن ٹھرایا جاتا۔

اور دارقطنی کے الفاظ یہ ہیں :۔

ان حکیم بن حزام صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یشترط علی الرجل اذا اعطاہ مالا مقارضۃً یضرب لہ بہ ان

لا تجعل مالی فی کبد رطبة ولا تحمله فی بحر ولا تنزل به فی بطن مَسِیل فان فعلت شیئا من ذٰلك فقد ضمنت مالی ۔

(ص ۳۱۵ ۔ سنن الدارقطنی)

ترجمہ: عروہ بن زبیر نے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکیم بن حزام کے متعلق روایت کیا کہ وہ جب کسی شخص کو مال مضاربت پہ دیتے تو بطور شرط اس کے لئے بیان کرتے کہ وہ اس مال سے جانوروں کی خرید و فروخت بھی نہیں کرے گا، اس کے ساتھ دریائی سفر بھی نہیں کرے گا، ایسی وادی میں بھی نہیں ٹھہرے گا جس میں سیلاب آتا ہو، اگر اس نے ایسا کیا تو نقصان کا وہ خود ضامن و ذمہ دار ہوگا ۔

یہ روایت ایک سند کے لحاظ سے ضعیف ہے جس میں ابن لھیعہ نامی ایک راوی ہے کیونکہ ابن لھیعہ کی شخصیت علماءِ جرح و تعدیل کے حلقے میں خاصی متنازعہ فیہ ہے ۔ اگرچہ اس کی توثیق کرتے تو بیشتر تضعیف بھی کرتے ہیں، علامہ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عبد اللہ بن لھیعہ کے تذکرہ میں وہ سب اقوال یکجا جمع کر دیئے ہیں، غرضیکہ جن محدثین حضرات کی نظر میں ابن لھیعہ ناقابل اعتبار ہے ان کے نزدیک روایت مذکور ضعیف اور جن کے نزدیک ثقہ اور قابلِ اعتبار ہے ۔ ان کے نزدیک روایت قوی ہے ، البتہ دوسری سند کی رو سے بالاتفاق قوی ہے جس میں ابن لھیعہ کی جگہ حیوۃ بن شُریح ہے جو بالاتفاق ثقہ راوی ہے ۔

قراض و مضاربت کے ثبوت میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا بھی ایک اثر پیش کیا جاتا ہے ۔ جو امام بیہقی نے سنن الکبریٰ میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے:

عن ابی الزبیر عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ انہ سألہ عن الرجل یعطی المال قراضا فیشترط لہ ، قال لا بأس بہ ۔ ص ۱۱۱ ، ج ۶ ۔ السنن الکبری

ترجمہ: ابوزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت کیا کہ اس نے ان سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جو دوسرے کو مال مضاربت پہ دیتا اور اپنے فائدہ کے لئے شرطیں لگاتا ہے ۔ فرمایا: کچھ حرج نہیں ۔

چونکہ اس روایت کی ایک ہی سند ہے جس میں مذکورہ بالا راوی ابن لھیعہ موجود ہیں لہٰذا محدثین کے نزدیک یہ روایت کمزور اور ضعیف ہے ، حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب ــ

تلخیص الجبیر میں اس کے ذکر کے بعد فرمایا ہے: "وفی اسنادہ ابن لھیعہ" اس کی اسناد میں ابن لھیعہ ہے۔ ص ۵۸ - ج ۳

قراض و مضاربت کے جواز کے ثبوت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی ایک قول پیش کیا جاتا ہے۔ جو مصنف عبدالرزاق میں اس طرح ہے۔

عن الشعبی عن علی رضی اللہ عنہ فی المضاربۃ الوضیعۃ علی المال والربح علی ما اصطلحوا علیہ ص ۲۴۸ - ج ۸

ترجمہ: شعبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روائت کیا کہ مضاربت میں نقصان ہو تو مال پر پڑتا ہے اور نفع ہو تو اس تناسب سے تقسیم ہوتا ہے جو ان کے مابین طے پایا تھا۔

اس روائت میں جو بات بیان فرمائی گئی ہے وہ مضاربت کی حقیقت اور تعریف سے متعلق ہے۔ اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں بھی مضاربت کی یہی حقیقت عرف عام میں معروف اور جانی پہچانی تھی کہ اس میں نقصان مال والے کو برداشت کرنا پڑتا اور نفع دونوں کے مابین طے شدہ نسبتی حصّہ سے بٹتا تھا۔ اسلام نے اس معاملہ کو اس کی سابقہ جانی پہچانی حقیقت پر برقرار رکھا۔ البتہ کچھ قیود کا ضرور اضافہ کیا ہے۔ جن کی تفصیل فقہ اسلامی میں درج ہے۔

مضاربت کے متعلق ایک اثر حضرت عبداللہ بن مسعود کا بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جسے امام شافعیؒ نے کتاب اختلاف العراقیین میں اس سند سے بیان کیا ہے۔

عن ابی حنیفۃ عن حماد عن ابراھیم عن ابن مسعود انہ اعطی زید بن خلیدۃ مالا قراضا۔ ص ۵۸ - ج ۳ - تلخیص الجبیر۔ ص ۱۱۵ - ج ۴ نصب الرایہ۔ ص ۲۲۵ - ج ۵ - نیل الاوطار

حضرت امام ابوحنیفہ نے حماد سے اس نے ابراہیم سے اس نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روائت کیا کہ انہوں نے زید بن خلیدہ کو مال قراض پر دیا۔

کتب حدیث میں متعدد ایسی روایات مذکور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے اپنے زیر تولیت یتیموں کا مال دوسروں کو مضاربت پر دیا: مثلاً امام بیہقی کی کتاب کتاب المعرفۃ کے حوالے سے امام جمال الدین الزیلعی نے نصب الرایہ میں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک اثر بیان کیا ہے جو اس طرح ہے۔

عن حُميد بن عبد الله بن عبيد الانصاری عن ابیہ عن جدہ ان عمر بن الخطاب اعطاہ مال یتیم مضاربۃ وکان یحمل بہ بالعراق ۔ ص ۱۱۵ ۔ ج ۴ نصب الرایۃ ۔ ص ۲۲۶ ۔ ج ۵ نیل الاوطار

ترجمہ: حُمید نے اپنے باپ عبد اللہ سے اور عبد اللہ نے اپنے باپ عبید انصاری سے روایت کیا کہ حضرت عمر بن الخطاب نے اس کو یتیم کا مال مضاربت پہ دیا اور وہ اس کے ساتھ عراق میں کام یعنی تجارت کرتا تھا۔

السنن الکبریٰ میں دوسری روایت ان الفاظ سے ہے:

حدثنی الحکم بن ابی العاص قال قال لی عمر بن الخطاب ھل قبلکم متجر وان عندی مال الیتیم قد کادت الزکاۃ ان تأتی علیہ قال قلت نعم، قال فدفع الیّ عشرۃ آلاف فغبت عنہ ماشاء اللہ ثم رجعت الیہ فقال لی ما فعل المال؟ قال قلت ھُوَ ذا بلغ مائۃ الف۔ قال رد علینا مالنا، لاحاجۃ لنا بہ ص ۳ ۔ ج ۶

ترجمہ: مجھ سے حکم بن العاص نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ حضرت عمر بن الخطاب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہاری طرف تجارت کا کوئی موقعہ ہے ۔ میرے پاس یتیم کا مال ہے خیال ہے کہ کہیں زکوٰۃ اسے ختم نہ کر دے، میں نے جواب میں عرض کیا ہاں موقع ہے۔ چنانچہ آپ نے مجھے دس ہزار دے دیئے میں نے کر کافی عرصہ غائب رہا، پھر جب ان کی طرف لوٹا تو انہوں نے دریافت فرمایا کہ اس مال کا کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا وہ یہ ہے - ایک لاکھ کو پہنچ گیا ہے ۔ تو اس پر حضرت عمر فاروق نے فرمایا۔ ہمارا اصل مال ہمیں واپس دے دو۔ ہمیں اس سے زائد کی کچھ حاجت نہیں ۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یتیم کا مال مضاربت پہ دینے کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو رائے تھی وہ بعد میں کسی وجہ سے بدل گئی، سنن الکبریٰ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی ایک روایت ہے کہ وہ یتیم کا مال مضاربت پہ دیتے تھے ۔

عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کان یکون عندہ مال الیتیم فیزکیہ ویعطیہ مضاربۃ ویستقرض منہ ص ۱۱۱ - ج ۶

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس یتیم کا مال ہوتا تو وہ اس کی زکوٰۃ بھی نکالتے، اسے

مضاربت پر بھی دیتے اور اس سے قرض بھی لیتے۔
مبسوط السرخسی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی ایک روایت ہے کہ وہ یتیم کا کا مال مضاربت پر دیتے تھے، روائت کے الفاظ یوں ہیں:

عن علی رضی اللہ عنہ انہ کان یعطی مال الیتیم مضاربۃ ویقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع القلم عن ثلاثۃ عن الغلام حتی یحتلم، وعن المجنون حتی یعقل وعن النائم حتی یستیقظ۔

ص ۲۰ - ج ۲۲

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ یتیم کا مال مضاربت پر دیتے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین شخصوں کا گناہ نہیں لکھا جاتا نابالغ بچے کا یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے، مجنون کا یہاں تک کہ وہ ٹھیک ہو جائے اور سوئے ہوئے کا یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے"

کتاب مذکور میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق بھی روائت ہے کہ انہوں نے اپنے یتیم بھتیجوں کا مال مضاربت پر دیا، الفاظ یہ ہیں:

عن القاسم بن محمد قال کان لنا مال فی ید عائشۃ رضی اللہ عنہا وکانت تدفعہ مضاربۃ فبارک اللہ لنا فیہ لسعیہا ۔ ص ۱۸

حضرت قاسم بن محمد نے روائت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کچھ مال ہماری پھوپھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور وہ اسے مضاربت پر دیتی تھیں۔ چنانچہ ان کی کوشش سے اللہ نے اس میں ہمارے لئے برکت فرمائی۔

سنن الکبریٰ میں اس روائت کے الفاظ اس طرح ہیں:

عن القاسم بن محمد قال کانت عائشۃ رضی اللہ عنہا تزکی اموالنا وانہا لتتجر بہا فی البحرین ۔ ص ۳ - ج ۴

ترجمہ ہے: حضرت قاسم بن محمد نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہمارے مالوں کی زکوٰۃ نکالتی تھیں اور اس کے ساتھ بحرین میں تجارت کرتی تھیں۔

اس روائت میں الفاظ میں مضاربت کا ذکر نہیں لیکن چونکہ وہ خود تجارت کا کام نہیں کرتی تھیں لہٰذا احتمال ہو سکتا ہے کہ دوسروں سے مضاربت پر کام کراتی ہوں۔

بہرحال کچھ روایات ایسی ضرور ملتی ہیں جن میں بعض صحابۂ کرام کے مالِ یتیم کو مضاربت پر دینے کا ذکر ہے جو ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے پیشِ نظر ہو جو جامع ترمذی اور سنن دارقطنی وغیرہ میں بایں الفاظ ہے:

"عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس وقال: اَلاَ مَنْ ولی مال یتیم فلیتجر لہ فیہ ولا یترکہ فتاکلہ الزکوٰۃ"

راوی کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے خطبہ میں فرمایا آگاہ رہو جو یتیم کے مال کا والی و نگران ہو اسے چاہیئے کہ یتیم کے فائدے کے لئے اس کے مال کو تجارت میں لگائے اور یونہی نہ چھوڑ دے کہ اس کو زکوٰۃ ہی کھا جائے۔

اور طبرانی میں وہ حدیث یوں ہے:

"عن انسؓ بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتجروا فی اموال الیتامیٰ لا تاکلھا الزکوٰۃ"

حضرت انسؓ بن مالک نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یتیموں کے مال کو تجارت میں لگاؤ تاکہ اس کو زکوٰۃ ہی نہ کھا جائے۔

السنن الکبریٰ میں حضرت سعید بن المسیّب اور حضرت عبدالرحمٰن بن السائب سے مروی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر اس طرح ہے۔

قال ابتغوا باموال الیتامیٰ لا تاکلھا الصدقۃ۔ فرمایا یتیموں کے اموال کے ساتھ تجارت کرو کہیں ان کو صدقہ ہی ختم نہ کر دے یعنی تجارت کے ذریعے ان کو بڑھاؤ تاکہ زکوٰۃ نکلتے رہنے کی وجہ سے ان میں کمی واقع نہ ہو

قرینِ قیاس یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا مذکورہ بالا حدیثِ نبویؐ کے پیشِ نظر فرمایا، نیز انہوں نے یتیم کا مال کسی کو مضاربت پر دیا تو وہ بھی اسی حدیثِ نبویؐ کے پیشِ نظر دیا تاکہ یتیم کو فائدہ پہنچے جو خود کمانے کے قابل نہیں ہوتا اور بڑوں کی اعانت و دستگیری کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جس پر احسان کرنے اور جس کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آنے کی قرآن و حدیث میں تعلیم اور ترغیب ہے، قرآن مجید میں کتنی ایسی آیات ہیں جن میں یتیموں کی ہمدردی و غمخواری اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے، اسی طرح احادیثؐ

نبویہ کی بھی بڑی تعداد ہے جن کے اندر مسلمانوں کو ترغیب کے مختلف اسلوبوں سے اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کی دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اس طرح ایک دوسرے کے قریب اور ساتھ ہیں جس طرح یہ دو انگلیاں۔

یہاں یہ عرض کر دینا مناسب و مفید ہوگا کہ جن احادیث و آثار میں یتیم کے مال پر وجوب زکوٰۃ کا ذکر ہے علمائے احناف ان کو ضعیف اور ناقابلِ استدلال کہتے ہیں اور بعض دوسری احادیث کی بنا پر مالِ یتیم کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ ٹھہراتے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ آثار جن میں وجوب زکوٰۃ کے ساتھ یتیم کے مال کو مضاربت پر دینے کا ذکر ہے حنفی علماء کے نزدیک ناقابلِ استدلال ہیں۔ البتہ دوسرے علماء ان روایات کو صحیح اور قابلِ استدلال مانتے ہیں اور ان کی وجہ سے مالِ یتیم پر زکوٰۃ کے قائل ہیں، بہرحال ان روایات کو صحیح مان لینے کی صورت میں ان سے جو ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ مالِ یتیم پر زکوٰۃ بھی ہے اور ولیٔ یتیم، یتیم کے مال کے ساتھ خود بھی تجارت کر سکتا ہے اور کسی کو مضاربت پر بھی دے سکتا ہے۔ جبکہ مقصود یتیم کی خیر خواہی اور نفع رسانی ہو۔ اور پھر چونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ یتیم کے مال کو مضاربت پر دینے اور اس کے ساتھ خود تجارت کرنے کا مذکورہ روایات سے جو جواز ظاہر ہوتا ہے اس کا سبب یتیم کی مخصوص حالت ہو یعنی نادانی و ناتوانی کی وجہ سے اس کا بے بس و محتاج ہونا، لہٰذا ان روایات سے ان لوگوں کے لئے مضاربت کا جواز بلا کراہیت ثابت نہیں کیا جا سکتا جو یتیموں کی طرح بے بس و ناتواں نہیں اور خود کام محنت کر کے کما کھا سکتے ہیں، بالفاظِ دیگر مطلب یہ کہ جو چیز یتیموں کے لئے ان کی مخصوص حالت کی بنا پر جائز ہو اسے غیر یتیموں کے لئے جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کہ اگر مضاربت ہر ایک کے لئے یکساں طور پر بلا کراہت جائز ہوتی تو صحابۂ کرام کے درمیان اس کا عام رواج ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ حدیث کے دفاتر میں بمشکل دو تین مثالیں ملتی ہیں جو پچھلے نقل کی گئیں غور و فکر سے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ صحابۂ کرام کے سامنے ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات تھے جن میں اپنے ہاتھ سے محنت و مشقت کر کے کمانے کھانے کی بڑی فضیلت اور اس پر بڑے اجر و ثواب کی بشارت تھی اور دوسری طرف وہ احادیث نبویہ تھیں جن میں یہ ہدایت تھی کہ تمہارے پاس ضرورت سے زائد مال ہو تو دوسرے ضرورت مند کو پہلے تو یونہی مفت صدقہ و ہبہ کے طور

(بقیہ صـ۵۲ پر)

تبصرۂ کُتُب

نام کتاب : اسلام کا نظامِ مساجد
مصنف : مولانا ظفر الدین
صفحات : ۲۴۴
قیمت : ۲۵ روپے
ناشر : عمران اکیڈمی، ۴۰ بی اُردو بازار لاہور

اسلامی معاشرے میں مسجد کو جو مقام و اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور مسلمانوں کی اجتماعیت اسی سے وابستہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں نظامِ مساجد پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے ضمنی مباحث مثلاً نماز، نظمِ جماعت، اذان اور امامت وغیرہ سے بھی بھرپور تعرض کیا گیا ہے۔ مسجد کی تعمیر و تزئین، اُس کے لوازمات، اُس کے آداب اور اُس سے متعلق وقف و تولیت کے مسائل پر بھی سیر حاصل بحث موجود ہے۔

درحقیقت یہ کتاب صرف مولانا محمد ظفیر الدین صاحب کی کاوش کا نتیجہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تیاری میں بعض دوسرے متقدر علماء مثلاً سید سلیمان ندوی مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے مشورے اور رہنمائی بھی شامل ہے۔

ہماری رائے میں یہ کتاب نظامِ مساجد پر ایک نہایت جامع، مفصل اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور اُردو زبان میں اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔

یہ کتاب پہلے بھارت میں شائع ہوئی ہے اور اب پاکستان میں اسے نئی کتابت کے بغیر ری پرنٹ چھاپ دیا گیا ہے۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ یہ کتاب پیپر بیک میں ہے۔

نام کتاب : تحریکاتِ ملّی (مجلّہ علم و آگہی کا خصوصی نمبر)
صفحات : ۴۵۶
قیمت : درج نہیں ہے۔

زیرِ نظر کتاب درحقیقت گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کے مجلّہ "علم و آگہی" کا تحریکاتِ ملّی نمبر (۸۳ - ۱۹۸۲ء) ہے۔ اس میں مسلمانانِ پاک و ہند کی سیاسی جدوجہد بیان کی گئی ہے۔ مستند تاریخی حوالوں کے ساتھ مختلف تحریکات مثلاً تحریکِ اصلاح و جہاد، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، تحریک خدّام کعبہ، تحریک ریشمی رومال، تحریک ہجرت، تحریک خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کا مفصّل تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس خصوصی نمبر کے مرتبین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد اور پروفیسر فصیح الدین صدیقی ہیں اور اس میں شامل مقالات ملک کے مشاہیر اہلِ قلم کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری، مولانا سعید الرحمٰن علوی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، سید حسین حسنی اور مولانا محمد طیّب شامل ہیں

ماضیٔ قریب میں مسلمانانِ برصغیر کی ملّی تحریکات پر تحقیقی انداز میں اور یکجا طور پر غالباً یہ سب سے پہلی کوشش ہے۔ ہماری رائے میں مجلّہ "علم و آگہی" کا یہ خصوصی نمبر اپنے مستند تاریخی حوالوں اور دستاویزات کی بدولت ایک تاریخی حوالہ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۳)

نام کتاب : تاریخ و تحریکِ پاکستان
صفحات : ۲۰۰
قیمت : درج نہیں ہے۔

یہ کتاب بھی دراصل گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کے مجلّہ "علم و آگہی" کا خاص نمبر ہے اس میں تحریکِ پاکستان سے متعلق مضامین و مقالات جمع کیے گئے ہیں، مباحث میں نظریۂ پاکستان، دو قومی نظریہ، علی گڑھ تحریک اور مسلم لیگ کی جدوجہد قیامِ پاکستان شامل ہیں، اس کا انداز و اسلوب تحقیقی نہیں ہے بلکہ اوسط سطح کا ہے۔ بہرحال نظریۂ و تحریکِ پاکستان سے متعلق موضوعات کے بارے میں خاصی اچھی معلومات

مرتب ہوگئی ہیں ۔

(۴)

نام کتاب : جوہرِ تقویم
مصنف : ضیاء الدین لاہوری
صفحات : ۱۲۰
قیمت : ۱۵ روپے
ناشر : الحقائق، آصف بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

اس کتاب میں ابتدا سے لے کر ۱۵۰۰ھ تک تمام ہجری اور اس کے مقابل عیسوی تاریخیں درج کی گئی ہیں ۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کا مکی و مدنی کیلنڈر بھی شامل ہے جو ایک نایاب چیز ہے ۔ جدولِ ایام کے تحت دونوں کیلنڈروں میں ایک جامع نقشہ بھی دیا گیا ہے جس سے مطلوبہ دن معلوم کیا جا سکتا ہے ۔ اس تقویم سے محققین کے علاوہ عام قاری بھی بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ کتاب نہایت محنت و کاوش اور دقتِ نظر سے تیار کی گئی ہے ۔ اردو زبان کی تقویمات میں یہ ایک گرانقدر اور مفید اضافہ ہے ۔

نام کتاب : شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کی تیس مجالس
مرتب : مولانا تقی الدین ندوی
صفحات : ۲۳۲
قیمت : ۲۰ روپے
ناشر : عمران اکیڈمی، ۴۰ لی، اُردو بازار لاہور

یہ کتاب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی تیس مجالس کا تذکرہ ہے جسے اُن کے شاگرد و مرید مولانا تقی الدین ندوی نے مرتب کیا ہے ۔ ابتدا میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تحریر کردہ مقدمہ بھی شامل ہے ۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے یہ تمام ملفوظات بالعموم ماہِ رمضان کی خاص اور مبارک مجالس سے حاصل کئے گئے ہیں ۔ ان ملفوظات میں شریعت کے مسائل اور طریقت کا سوز و گداز ہے ۔ اندازِ بیان نہایت حکیمانہ اور واعظانہ ہے ۔

سیرتِ نبوی ؐ کے ضمن میں ۲ دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے ✻ اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

★ رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم ★

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ، اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسول ؐ

سورۂ احزاب ؎ رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر ✿ ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب ✿ محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل۔ نزد آرام باغ، کراچی ۱ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 3 | JANUARY 1985 | No. 11

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ